علامہ سید سلیمان ندوی
بحیثیت مورخ
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

حرف آغاز

علامہ سید سلیمان ندوی کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنی ذات سے خود ایک دبستان تھے۔ ان کے کارنامے اتنے وسیع اور متنوع ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنے اور ان پر تفصیلی محاکمہ کرنے کے لیے کئی دفتر درکار ہوں گے۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان پر اب تک متعدد کتابیں اور سیکڑوں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ ابھی تک حق ادا نہیں ہو سکا ہے۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ جو شخص سرچشمۂ عقل و دانش اور سراپا علم ہو، اس پر جتنا بھی لکھا جائے، کم ہی ہے۔ اس کی تحریروں کا جتنا مطالعہ کیجیے، اتنے ہی نئے گوشے نکل کر سامنے آئیں گے۔ اور ہر گوشہ انتہائی تابناک اور روشن۔ ہر پہلو کو دیکھ کر یہی محسوس ہوگا کہ یہی سب سے زیادہ روشن ہے اور اسی سے ہم کو کسب نور کرنا چاہیے۔

زفرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

آج کل ضرورت اس بات کی ہے کہ بجائے ضخیم اور مبسوط سوانح لکھنے کے، مناسب یہ ہو کہ شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی جائیں، اور ہر پہلو پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ مختلف حضرات اپنے اپنے ذوق اور خصوصی دلچسپی کے مطابق کام کر سکیں گے اور اس موضوع کا حق ادا کر سکیں گے۔ اور چوں کہ یہ کام زیادہ ضخیم نہ ہوں گے اس لیے انہیں کتابی شکل میں شایع کرنے اور عام قاری کو انھیں حاصل کرنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہوگی۔

خوشی کی بات ہے کہ اعظم گڑھ کی سرزمین سے، جہاں سید صاحب نے اپنی عمر

عزیز کا بیشتر حصہ گزارا اور علمی کام انجام دیے، ایک جواں سال اور جواں ہمت محقق ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اس راز کو سمجھا اور سید صاحب کے مختلف النوع کارناموں میں سے ایک کو موضوعِ بحث بنایا۔ انھوں سے سید صاحب کی تاریخی بصیرت پر اظہار خیال کیا ہے اور مختلف عنوانات قایم کر کے ان کی تاریخی تصانیف اور مضامین سے بحث کی ہے۔ ان کا انداز تحریر سادہ اور سلیس ہے، جس سے موضوع و مباحث کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ضخامت کو بھی محدود رکھا ہے جس سے ناشرین اور قارئین دونوں کو فائدہ ہوگا۔

امید ہے کہ خدابخش لائبریری کی دیگر مطبوعات کی طرح اسے بھی قبول عام نصیب ہوگا۔

محمد ضیاء الدین انصاری

فہرست

❁ ❁ ❁

پیشِ لفظ

علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) کی ذات سراپا علم و دانش تھی۔ وہ ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے ممتاز ترین عالم و دانش ور، سیرت نگار اور مورخ و محقق تھے اور مدۃ العمر مختلف علمی موضوعات پر داد تحقیق دیتے رہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے بعد وہ برصغیر کے واحد ایسے اہل علم تھے جنہوں نے پوری علمی دنیا کو اپنے کارناموں سے متاثر کیا۔ اسی لیے شاعر مشرق علامہ اقبال نے ان کو علامہ شبلی کے بعد استاد الکل اور علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیا۔

سید صاحب کا خاص موضوع سیرت و تاریخ تھا وہ نہ صرف بالغ نظر، دیدہ ور اور صاحب شعور مورخ تھے بلکہ فن تاریخ کے مالہ و ماعلیہ پر ان کی پوری نظر تھی انہوں نے تاریخی موضوعات پر داد تحقیق دینے کے ساتھ اس کے اصول وضوابط پر مجتہدانہ نگاہ ڈالی۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے تاریخ نویسی کے جن بنیادی اصولوں کی طرف انہوں نے توجہ دلائی وہ آج بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سید صاحب نے اپنی تحریروں میں غلط تاریخ نویسی پر تنقید کی اور اس کے مضمرات سے خاص طور پر آگاہ کیا۔ مورخین کو قیمتی اور مفید مشورے دیے اور سیاسی تاریخ کی بہ نسبت تہذیبی و تمدنی تاریخ نویسی پر خصوصیت سے زور دیا، زیر نظر مقالہ میں سید صاحب کی اس طرح کی تمام کوششوں اور کاوشوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ سید صاحب کے لازوال کارناموں پر متعدد کتب و مضامین شائع ہو چکے ہیں تاہم ان کے تاریخی کارناموں

پر مجموعی لحاظ سے یہ پہلی کوشش ہے۔ امید ہے یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

اس مقالہ کی تکمیل کے لیے بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہوں کہ اس کی توفیق ہی سے ہر کام انجام پاتا ہے۔ بزرگوں میں مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور احباب میں عمیر الصدیق ندوی، عارف عمری اور ڈاکٹر جاوید علی خاں کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ ان لوگوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی اور میرے علمی کاموں کی پذیرائی کی ہے، طباعت کے لیے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کا ممنون ہوں کہ اس کی توجہ سے یہ مقالہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آرہا ہے۔ خدا کرے اسے حسن قبول نصیب ہو۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مورخہ یکم اکتوبر ۲۰۰۰ء
ادب کدہ
انوار گنج، مہاراج پور
اعظم گڑھ (یوپی)

علامہ سید سلیمان ندوی اور غلط تاریخ نویسی پر نقد و جرح

علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت مجموعہ کمالات تھی وہ علوم قرآنیہ کے رمز شناس، احادیث کے پارکھ، مورخ و محقق، مفکر و متکلم، نقاد، ادیب وشاعر، ماہر تعلیم، سیاست مدن کے مدبر اور باکمال صحافی تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ حضور اکرم ﷺ کے سیرت نگار تھے ان کی اسی جامعیت اور ہمہ گیری کی بنا پر علامہ اقبال نے علامہ شبلی کے بعد انہیں استاد الکل، رئیس العلماء اور علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیا تھا۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی جیسی عبقری ہستی کے زیر سایہ ان کی نشو ونما ہوئی، جمال مرشد کے کامل جذب وعکس اور مدۃ العمران کے افکار و خیالات کی ترویج واشاعت کی وجہ سے بجاطور پر وہ ان کے شاگرد رشید، جانشین اور ان کے علمی وفکری ورثہ کے امین و پاسباں قرار دیے گئے۔

علامہ شبلی اپنے عہد کے سب سے بڑے مورخ تھے چنانچہ سید صاحب کو بھی تاریخی ذوق ان سے ورثے میں ملا اور انہوں نے اپنی محبت، کاوش، مطالعہ وتحقیق، دقت نظر اور تدبر و تفکر سے اس میں مزید وسعت پیدا کی۔

تاریخ کے علم وفن پر سید صاحب کی گہری نظر تھی، انہوں نے اسلام اور ہندوستان دونوں کی تاریخ کا نہایت محنت اور باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا قدیم مورخین اسلام کے اصول ونظریات سے واقف ہونے کے علاوہ وہ جدید مورخین اور ان کے اصول وطرز فکر سے بھی باخبر تھے علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ (۲) سے ان کا متاثر ہونا فطری تھا چنانچہ وہ اسی نظریہ شبلی کے ہمیشہ مکمل پیرو و متبع رہے، ان کی تصنیفات میں اگر چہ مستقل کوئی تاریخ نہیں

ہے لیکن تاریخ کے متعدد پہلوؤں پر ان کی تحریریں فن و اصول تاریخ کی حیثیت سے بہت اہم ہیں جن کی نمایاں خوبی اپنے عہد کے رواج کے مطابق تہذیبی وتمدنی تاریخ کا مطالعہ تجزیہ ہے ان کے سیکڑوں تاریخی مضامین میں دو ایسے ہیں جن کا تعلق خالص سیاسی تاریخ سے ہے بقیہ مضامین خواہ وہ تاریخ اسلام یا تاریخ ہند سے متعلق ہوں ان کا تعلق تہذیبی و تمدنی تاریخ سے ہے۔

سید صاحب کا خیال تھا کہ تاریخ قوموں کی روح ہوتی ہے (۳) اور وہ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں بلکہ ہر زمانے میں ملک کی عام علمی، تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ ہی تاریخ کا اہم موضوع ہے (۴) ان کو احساس تھا کہ قدیم تاریخوں کا بہت بڑا نقص رہا ہے کہ ان میں صرف سیاسی واقعات لکھے گئے اور قدیم مورخین نے اسی کو اصل تاریخ تصور کیا جس سے یہ نقصان ہوا کہ تہذیب وتمدن کے بہت نقوش وآثار مٹ گئے۔ تہذیب ومعاشرت کی تاریخ پر وہ اسی لیے بہت زور دیتے تھے۔

سید صاحب کی تاریخ نویسی کے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا یہ قول بڑا دلچسپ ہے کہ تاریخ ان کے علمی دسترخوان کی محض چٹنی ہے (۵) لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیرت نگاری کی وجہ سے تاریخ کا موضوع ہمیشہ ان کی نظر میں رہا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے قلم سے متعدد تاریخی کتابیں اور مقالات ومضامین نکلتے رہے تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کی ترتیب وتدوین کے منصوبے بنائے اور ان کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کی ہر ممکن کوشش بھی کی جس کی تفصیل آئندہ پیش کی جائے گی۔

اس ضمن میں وہ اکثر غلط تاریخ نویسی پر نقد وجرح اور تردید وتصحیح کرنے کے علاوہ دوسروں کو مفید اور قیمتی مشورے بھی دیتے رہے تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے تعلق سے جب بھی مستشرقین اور ان کے ہم نوا مورخین نے غلط بیانی کی یا بے جا اعتراضات کئے تو ان کے جواب کے لیے سب سے پہلے سید صاحب کا قلم نیام سے باہر آیا، یہ بجائے خود ایک اہم تاریخی کارنامہ ہے، یہاں اسی اجمال کا نسبتاً مفصل جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

اغلاط تاریخی کی تصحیح:

۱۹۱۰ء میں علامہ شبلی نعمانی نے تاریخ میں انگریز مورخوں کی غلط بیانیوں اور ہرزہ سرائیوں کی تردید و تصحیح کے لیے ندوۃ العلماء میں صیغہ اغلاط تاریخی قایم کیا اور سید صاحب کو اس کا سکریٹری بنایا چنانچہ سید صاحب نے علاوہ شبلی کی زیر نگرانی اس کام کو نہایت محنت و دلچسپی سے انجام دیا، مختلف یونیورسیٹوں اور اسکولوں کے مسلمان اساتذہ اور اہل علم سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی جس کی وجہ سے تاریخ ہند کے بعض قابل اعتراض مقامات کی نشاندہی ممکن ہوئی، الہ آباد، کلکتہ اور بعض دوسری یونیورسٹیوں کے جونیئر درجات میں پڑھائی جانے والی مسٹر مارسڈن کی کتاب تاریخ ہندوستان اور ڈیلاقوس کی کتاب تاریخ ہند کے قابل اعتراض اور لغو باتوں کی نشاندہی کر کے ان کے خلاف اخبارات و رسائل میں مضامین لکھ کر ایک تحریک کا آغاز کیا گیا(۶) جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے خود مسٹر مارسڈن نے اپنی کتاب میں ترمیم کرنا قبول کیا(۷)۔

سید صاحب نے الہ آباد یونیورسٹی کی تاریخ و جغرافیہ کی بعض دوسری کتابوں کی تصحیح کی طرف بھی توجہ دے کر ان کے قابل اعتراض مقامات کی نشاندہی کی اس کے علاوہ دوسرے صوبوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی بعض کتابوں کا بھی جائزہ لیا(۸)

سید صاحب بڑے انہاک سے اس کام کو سرانجام دینے میں مصروف تھے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے بھی اسی طرز پر اغلاط تاریخی کی تصحیح کے ایک منصوبہ کا اعلان کر دیا، علامہ شبلی نعمانی سید صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> تمہارے مضمون تصحیح اغلاط پر ارباب علی گڑھ کس قدر جلد چونکے فوراً ایک
> کمیٹی قائم ہوئی اور مختلف کورسوں کی جانچ کے لیے مختلف کمیٹیاں قائم ہوئیں
> لیکن ندوہ کا ذکر نہیں بلکہ بیان کیا گیا کہ یہ کام ہم پہلے سے کر رہے ہیں خیر کام
> ہونا چاہیے کہیں سے ہو(۹)

یہ قومی کام باہمی اشتراک و تعاون کا متقاضی تھا اس لیے سید صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس کے ذمہ داروں سے باہمی تعاون و اتفاق کی خواہش ظاہر کی مگر افسوس کہ اس کا حوصلہ افزا جواب نہ ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کام نہ ندوہ میں ہوسکا اور نہ ایجوکیشنل کانفرنس کرسکی (۱۰)

بہر حال اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سید صاحب کے تاریخی ذوق کی جو آبیاری ہوئی وہ مدۃ العمر قائم رہی چنانچہ آئندہ جب بھی تاریخ کے کسی پہلو کو مجروح کیا گیا یا دانستہ غلط بیانی کی گئی تو ان کے تاریخی شعور نے فوراً ردعمل کا اظہار کیا۔

سید صاحب کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں سے اہل علم ان کو اغلاط تاریخی کی نشاندہی کے ذریعہ باخبر کرتے خصوصاً غیر اردو زبانوں میں اس قسم کے غلطیہائے مضامین سے باخبر کرتے رہتے اور اخبارات و رسائل کے تراشے سید صاحب کے پاس اس غرض سے ارسال کرتے کہ ان کے رد و تصحیح سید صاحب کے پرزور قلم سے ہو (۱۱) سید صاحب خود بھی یہ فریضہ انجام دیتے اور دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کرتے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے انگریزوں نے ہندوستان کی تاریخ میں جو زہر بھرا تھا اس کی تصحیح و اصلاح ہندوستان کے بہی خواہ مورخین کے ہمیشہ پیش نظر رہی سید صاحب کا تو یہ خاص موضوع تھا وہ خود بھی اس پر لکھتے رہتے تھے اور دوسرے مورخین کو بھی توجہ دلاتے رہتے تھے (۱۲)

انگریزوں کی غلط تاریخ نویسی کے بنیادی مقاصد:

اہل نظر سے یہ مخفی نہیں کہ ہندوستان میں انگریز مورخوں نے اپنی استعماری حکومت کے جواز اور استحکام کے لیے ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دینے پر خاص توجہ کی اور ، کے لیے ہندوستان کے سابقہ مسلمان حکرانوں کو ظالم و جابر، ہندوکش، بت شکن، علوم

وفنون کا دشمن ثابت کرنے کی حتی الامکان کوشش کی خصوصا بت شکنی کے فرضی واقعات کو انہوں نے اپنی تاریخوں میں اس طرح بڑھا چڑھا کر لکھا کہ ہندوؤں کے دلوں میں ان مسلمان حکمرانوں کے لیے نفرت و عداوت کے جذبات پیدا ہوں اور ردعمل میں وہ انگریزوں کی حکومت کو سابقہ مسلم حکومتوں کے مقابلہ میں بہتر تصور کرنے لگیں اور پھر یہ دونوں قومیں نفرت اور دشمنی کا شکار ہو کر ان کے خلاف متحد نہ ہو سکیں۔

اس مقصد کی برآری کے لیے تاریخ سے زیادہ موزوں اور کون موضوع ہوسکتا ہے چنانچہ ان سامراجیوں نے تاریخ کے صفحات کو مسخ کر کے مروجہ نصاب تعلیم میں بڑی چابک دستی سے شامل کر دیا بقول سید صاحب:

> سرکاری مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم کا اضافہ بظاہر علم کے اضافہ کے لئے ہے، مگر درحقیقت یہ اقوام ہند کے قدیم اختلافات ونزاعات کے اضافہ کے لیے ہے .... ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈھ، ڈھونڈھ کر ایسی ہی باتیں جمع کی جاتی ہیں جن سے ان دونوں قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو اور اس کا اتفاق آئندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے ان دونوں قوموں کے درمیان اختلاط ومحبت کے جذبات پیدا ہوں (۱۳)۔

اس نصاب تعلیم کی زہرناکی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ طلبہ پر اس کے برے اثرات کی ایک تصویر رام پور ریاست کے سابق فائنانس منسٹر خان بہادر مولوی محمد حسین صاحب کی اس تحریر میں ملاحظہ ہو:

> مجھ پر جو اثر نصاب تاریخ کا ہوا وہ یہ ہے کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں جب راجہ شیو پرشاد کی تاریخ ہندوستان اسکول میں پڑھتا تھا تو مجھے ہندو ہم جماعت طالب علموں کے سامنے مسلمان بادشاہوں کے حالات پڑھ کر نہایت

شرم آتی تھی اور آنکھ نیچی کرنی پڑتی تھی وہ کیفیت ابتک نہیں بھولا ہوں۔ اس کے بعد جب انٹرنس میں سرولیم ہنٹر کی مختصر تاریخ ہند پڑھنے کی نوبت آئی تو اس کے بعض حصے ابتک دل پر نقش فی الحجر ہیں۔ مثال کے طور پر چند فقروں کا ذکر کافی ہوگا.......... ''اورنگ زیب ایک اچھا فرماں روا ہوتا اگر قید کرنے کے لیے اس کا باپ نہ ہوتا، قتل کرنے کو بھائی نہ ہوتے اور ظلم کرنے کے واسطے ہندو رعایا نہ ہوتی۔'' یہ نمونہ ہے ان زہریلی تحریروں کا جو مسلمان بادشاہوں کے متعلق عام طور پر طالب علم مدارس میں پڑھتے ہیں ...... جس قوم کے نونہالوں کی تعلیم کی بنیاد اس طریقہ پر رکھی گئی ہو آگے چل کر ان کے خیالات مسلمان بادشاہوں اور ان کی حکومت کے متعلق کیسے ہوں گے...... جس قدر آتش غیظ وغضب اور انتقامی جذبات طبیعتوں میں نہ بھڑکیں کم ہیں اور کس کے مقابلہ میں یہ عملی جامہ پہن سکتے ہیں صرف موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے مقابلہ میں (۱۴)

اس اشتعال ونفرت انگیز نصاب تعلیم سے سب سے زیادہ خطرہ تحریک آزادی کو تھا چنانچہ سید صاحب نے اہل وطن کے سامنے اس اہم نکتہ کو وضاحت سے بیان کیا کہ:

ہندوستان کو آگے چلنا ہے تو پیچھے مڑکر دیکھنا نہیں چاہئے آج اس بحث سے کہ سلطان محمود کا حملہ ہندوستان پر جائز تھا یا ناجائز اور شہاب الدین غوری نے کتنے مندر غارت کئے اور عالمگیر نے ہندوؤں پر کیا کیا ظلم کئے سوراج کی منزل میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، کیا ہمارے ہم وطن اس نکتہ کو سمجھیں گے۔ (۱۵)

تاریخ اسلام اور ہندوستان کے متعلق تاریخی دروغ گوئی کو طشت از بام کرنے کے سلسلے میں سید صاحب کی چند کاوشوں کو یہاں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا الزام:

مغربی مورخوں نے مسلمانوں پر یہ بے سروپا الزام عائد کیا کہ حضرت عمرؓ کے

زمانے میں جب مسلمانوں نے مصر و اسکندریہ فتح کیا تو انہوں نے وہاں کے صدیوں قدیم یونانی کتب خانہ کو جلا کر خاک کر دیا۔ اس الزام کی آڑ میں دراصل وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اسلام اور مسلمان علم دشمن ہیں۔ اس بے سروپا الزام کی سب سے پہلے علامہ شبلی نے تردید کی اور بہ دلائل ثابت کیا کہ مسلمانوں پر یہ الزام سراسر غلط ہے کیونکہ مسلمانوں کی فتح سے پہلے ہی یہ کتب خانہ خود عیسائیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اس کی تباہی و بربادی میں عیسائیوں کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا بھی شریک تھے۔ (۱۶)

اس محققانہ تردید کے باوجود بعض مورخین اس الزام کو مسلمانوں کے سر تھوپتے رہتے تھے چنانچہ سید صاحب نے علامہ شبلی کے حوالہ سے دوبارہ اس کی مکمل تردید کی۔ (۱۷)

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی :

مسلمانوں پر ایک بڑا الزام یہ بھی تھا کہ انہوں نے ہندوستان میں اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا۔ سید صاحب نے اس کے جواب میں ایک محققانہ مقالہ "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" کے عنوان سے لکھا جو ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا (۱۸) اس میں سید صاحب نے نہایت تفصیل سے بہ دلائل ثابت کیا کہ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت تلوار کے زور سے نہیں ہوئی بلکہ اس کا فروغ بھی اسی طرح ہوا جس طرح دنیا کے دوسرے مذاہب کا ہوا۔ (۱۹)

۱۹۳۰ء میں سید صاحب کے ایک دوست نے راجپوتانہ میواڑ سے انہیں مطلع کیا کہ میواڑ یونیورسٹی میں مسٹر اسمتھ کی تاریخ ہند پڑھائی جاتی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ "مسلمانوں نے ہندوستان آکر تلوار کی نوک سے اپنا مذہب پھیلایا اور کسی کو ایک بھاری رقم (جزیہ) ادا کئے بغیر اپنے مذہب پر قایم رہنے کی اجازت نہیں دی" (۲۰) چنانچہ سید صاحب نے مسٹر اسمتھ کی اس بددیانتی کی تردید کی اور لکھا کہ :

''اولاً تو یہ جان لینا چاہیے کہ یہ بھاری رقم (جزیہ) کیا ہے۔ دولت مندوں سے دس روپے اور غریبوں سے ڈھائی روپے، عورتیں، بچے، بوڑھے، معذور، مذہبی اہلِ منصب مستثنیٰ، ثانیاً کیا مورخ مذکور کو اس نوک شمشیر سے مسلمان کرنے کا کوئی واقعہ معلوم ہے اور اگر ہے تو کیا رومی عیسائی شہنشاہوں کی مملکت میں بت پرستوں کو اور سواحل ہند پر قبضہ کر کے ہندؤں کو زبردستی عیسائی بنانے کے واقعات سے وہ زیادہ ہیں۔(۲۱)

اس کے بعد سید صاحب نے یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے یہ سوال کیا کہ'' جب مسلمان عیسائیوں کے اس گھڑے ہوئے قصہ کو اپنے مذہب کی توہین کہتے ہیں تو ایسی کتابوں کو مشترک قوموں کے نصاب تعلیم میں داخل رکھنا کہاں تک موزوں ہے۔'' اور عیسائی مصنفین کو مخاطب کر کے فرمایا'' اب وقت آگیا ہے کہ عیسائی مصنفین اپنے عہد جاہلیت کے افسانوں کو علم و تحقیق کی روشنی کے عہد میں بھلا دیں ہم کو امید ہے کہ نصاب تعلیم سے ایسی لغو کتاب علٰحدہ یا اس میں مناسب اصلاح کردی جائے گی۔(۲۲)

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار:

تاج محل کے متعلق انگریز مورخوں نے یہ روایت گھڑی کہ اس کا معمار ایک اطالوی ماہر تعمیر تھا اس مفروضہ کی بھی سید صاحب نے نہایت تحقیق و تدقیق اور معتبر تاریخوں کی مدد سے تردید کی اور بتایا کہ تاج محل اور لال قلعہ کا معمار حقیقی نادرالعصر استاذ احمد لاہوری تھا۔ انہوں نے استاذ احمد لاہوری اور اس کے خاندان کی تاریخ اور ان کے علمی وتعمیری کارناموں کی سرگذشت بڑی تلاش وجستجو کے ساتھ پیش کی (۲۳) مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

تاریخ میں پہلی مرتبہ اس خاندان کے مورث اعلی نادر العصر استاذ احمد معمار شاہ جہانی لاہوری کے حالات اور اس کے بیٹے لطف اللہ مہندس کی

معاصرانہ شہادت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاذ
احمد معمار شاہ جہانی لاہوری ہے استاذ احمد ہندسہ، ہئیت اور ریاضیات کا بڑا عالم
تھا ان تحقیقات سے وہ تمام افواہیں جو تاج محل کے معماروں کے متعلق مشہور
تھیں بے سروپا ہو گئیں (۲۴)

۱۹۵۱ء میں دہلی کے اخبار اسٹیٹس مین کے انگریز کالم نویسوں نے یہ بحث دوبارہ چھیڑی تو سید صاحب کے حوالہ سے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے ان کی تردید کی جس کی تائید حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ نے بھی کی (۲۵)

انگریزوں کی حصول بہار کی ناروا کوششیں:

۱۹۳۰ء میں ہسٹاریکل ریکارڈ سوسائٹی کا اجلاس ہوا جس کے صدر مشہور مورخ سرجدوناتھ سرکار تھے اس میں مسٹر سرکانٹن نے ''پٹنہ میں انگریزوں کا قتل عام'' کے نام سے ایک بے سروپا تحریر پیش کی مگر اجلاس میں موجود شرکاء میں کسی نے نہ نکیر کی اور نہ اس پر جرح ونقد کی سید صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ کیا کوئی ہندوستانی مورخ ایسا نہ تھا جو صوبہ بہار کے حصول کی ناروا انگریزی کوششوں کا راز طشت از بام کرتا (۲۶) پھر اس واقعہ کے پس منظر میں مسلمان مورخین کو متنبہ کیا کہ:

> ہمارے مسلمان پروفیسروں اور مورخوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس مجلس کے ذریعہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا قالب ڈھالا جارہا ہے حیف ہے اگر مسلمان اس کی صورت گری سے غافل رہے ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی۔ جب تاریخ اپنی شکل بدل چکی ہوگی اور مفروضات واقعات بن چکے ہوں گے (۲۷)

نصاب تعلیم اور مسلمانوں کی ذمہ داری:

۱۹۳۱ء میں اخبارات کے ذریعہ سید صاحب کو معلوم ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی کے

شعبہ تاریخ اسلام میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی کتاب تاریخ ادبیات عربی پڑھائی جاتی ہیں، ان کتابوں میں اسلام اور متعلقات اسلام کی نسبت نہایت گمراہ کن خیالات اور رکیک و ناروا الزامات ہیں جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہیں کرسکتا (۲۸) سید صاحب نے یہ جان کر فوراً سخت گرفت کی۔ ان کو اور اس طرح کی دوسری کتابوں کو نصاب تعلیم میں داخل کرنے، ترجمے کرنے اور ان کو پڑھانے پر مسلمانوں کو سخت تنبیہ کی اور افسوس کا اظہار کیا کہ اس طرح کے کاموں کو کر کے مسلمان خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کا ایک بڑا کام انجام دے دیا (۲۹)

سید صاحب کا خیال تھا کہ تاریخ اسلام کی تدوین و تالیف جدید اسلوب میں منتقل کرنے کا کام جدید تعلیم یافتہ اشخاص کا تھا وہ اس کام کو انجام دے کر مسلمان طالب علموں کے دل و دماغ کی نشو و نما اور تربیت کا سامان بہم کر سکتے تھے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو تاریخ اسلام کا شعبہ قائم کر کے خود اپنے ہاتھوں سے اسلامی روح کو کیوں قتل کر رہے ہیں (۳۰)

سید صاحب کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سید امیر علی کو چھوڑ کر ایک بھی ایسا مورخ اور تاریخ اسلام کا مصنف ابتک پیدا نہیں ہوا جو خود اپنی تاریخ اسلام لکھتا یا جس کا قلم اسلام کی مدافعت میں چلتا اس کی انگریزی ادبیت اس قدر بلند معیار ہوتی کہ اس کی کتاب نصاب تعلیم کے مطابق ہوتی (۳۱) انہوں نے مسلمانوں کی عام علمی بے بضاعتی کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے:

> مسلمانوں کی علمی بے بضاعتی کا نتیجہ ہے کہ عربی کا کورس مقرر کیا جائے تو اس میں بیروت کے کیتھولک پادریوں کی کتابیں پڑھائی جائیں۔ اسلامی تمدن کا درس دینا ہو تو مصر کے عیسائی مصنف جرجی زیدان کی ان کتابوں کو پڑھاؤ جن کو مارگولیتھ کے قلم نے انگریزی میں منتقل کیا ہے عربی ادب کی تاریخ پڑھانی ہو تو نکلسن کی تاریخ ادبیات عربی ان کے درس میں داخل کرو اور اگر فرق اسلامی کی تاریخ جانی ہو تو وان کریمر کے ان مضامین کا مطالعہ کرو جن کو ایک مسلمان نے

انگریزی کا جامہ پہنایا ہے اگر اقوام اسلامی کی تاریخ کی تعلیم مقصود ہو تو ڈاکٹر
وائل کی کتاب ان کے ہاتھ میں دو اور انتہا یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں ادب
عربی سکھانا ہو تو عربی انجیل پڑھائی جائے۔ ہماری اس تلخ نوائی سے ہمارے
دوستوں کی بزم عیش تو مکدر نہیں ہو رہی ہے ؎

من از بیگانگاں ہر گز نہ نالم
کہ بامن ہر چہ کرد آں آشنا کرد (۳۲)

پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ اسلام کی جن کتابوں کے خلاف سید صاحب نے
آواز بلند کی وہ صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی بلکہ اخبارات و رسائل میں اس کی صدائے
بازگشت پر زور طریقے پر گونجی، بالآخر وائس پرنسپل مولانا محمد شفیع صاحب اور بعض دوسرے
مسلمان ارکان یونیورسٹی کی کوششوں سے نصاف تعلیم کو پاک کیا گیا۔ سید صاحب نے اس
قدم کی تعریف کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ:

> ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے دین وملت اور علوم وفنون کو اغیار کے دست
> تصرف سے بچانے کے لیے اسی قسم کے احساس غیرت اور مستحسن کوشش سے کام
> لیں تا کہ خود دار اقوام میں ان کا شمار ہو سکے...... ہمارے انگریزی داں فضلا اور
> اکابر اہل قلم غیروں کا بھروسہ چھوڑ کر خود قلم اٹھائیں، بلند سے بلند معیار کے مطابق
> اپنی تاریخ کو ترتیب دیں اور اس کو اپنے طالب علموں کے ہاتھوں میں دیں ورنہ
> محض شور وغل اور جوش وخروش سے اس مرض کا ازالہ نہ ہو سکے گا (۳۳)

تاریخ اسلام کے لیے نصابی کتاب دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اگلے سال
۱۹۳۲ء میں پنجاب یونیورسٹی نے سرے سے یہ شعبہ ہی ختم کر دیا جس کی وجہ سے پنجاب
کے مسلمانوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ سید صاحب نے اس احتجاج کو اگرچہ درست
قرار دیا تاہم اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں ہی کو ذمہ دار قرار دیا اور اس سلسلہ میں
ایک بار پھر ان کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا کہ:

ہر قوم کی تاریخ اس قوم کی روح ہوتی ہے کسی قوم کے تعلیمی جسم سے اس
کی روح کو سلب کر لینا کہاں کا انصاف ہے مگر ضرورت اس کی ہے کہ خود
مسلمان فضلا اپنی تاریخ کی طرف آپ متوجہ ہوں اور اپنا سرمایہ خود اپنے ہاتھوں
سے جمع کریں بغیر اس کے یہ مسئلہ بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ کی مثال ہوگا،
تاریخ اسلام رکھی جائے مگر کتابیں وہ ہوں جو ہمدردی کے بجائے عداوت کے
رنگ میں لکھی گئیں ہیں تو ان کا قبول کرنا بھی مشکل اور اگر اس ڈر سے سرے
سے تاریخ اسلام ہی حذف کر دی جائے تو بھی نا قابل قبول اس بنا پر مسلمانوں
پر دو کام فرض ہیں اول یہ کہ یونیورسٹی اس ضروری مضمون کو داخل نصاب کرے
دوسرے یہ کہ مسلمان کے لیے مناسب کتابیں بہم پہونچائیں یا ایسے لائق
اساتذہ رکھوائیں جو تعلیم و تدریس کے ساتھ فرض تالیف بھی انجام دیں (۳۴)

مسلمان مورخین کو مشورہ:

تاریخ اور متعلقات تاریخ سے متعلق سید صاحب نے مورخین اور خاص طور سے
مسلمان مورخین کو بار بار مفید اور قیمتی مشورے دیے اور ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔
ایک مسلمان مورخ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے تاریخ ہند پر کتاب لکھی جو
نصاب تعلیم میں داخل کی گئی اس میں انہوں نے بھی انگریزوں کی تقلید میں اسلام اور
مسلمانوں سے متعلق متعدد گمراہ کن باتیں نقل کر دیں سید صاحب نے اس پر تنقید کرتے
ہوئے مؤلف کو مشورہ دیا کہ:

> انہوں نے تاریخ ہند کے انگریز مورخوں کے بجائے ہندو مورخوں کی
> پیروی کیوں نہیں کی جو اپنے دھندلے تاریخی خاکہ کو اپنی کتاب کے ہر نئے
> ایڈیشن میں زیادہ رنگین بنا کر اور ابھار کر دکھاتے ہیں اور اپنی قومی تاریخ کو
> باوقار اور پر فخر بنانے میں نہیں شرماتے تو پھر ہم کیوں اپنی کمزوریوں سے آپ

شرماتے ہیں (۳۵)

مورخین مغرب کے تاریخی نقطہ نظر پر تنقید:

سید صاحب نے مغربی مورخین کی تاریخ نویسی کے بنیادی مقاصد اور ان کے نقطہ نظر پر بھی سخت تنقیدیں کی ہیں ان کا خیال تھا کہ قدیم مشرقی تاریخ مصدقہ واقعات عالم کا ایک مجموعہ ہوتی تھی جبکہ جدید مغربی تحقیق یہ ہے کہ تاریخ نویسی کا ایک مقصد اور غرض و غایت ہوتی ہے اور تاریخ بعینہ سیاسیات حاضرہ کا ایک مابہ الاختلاف موضوع ہے اور مورخ کا فرض ہے کہ وہ واقعات تاریخ کی ایک خاص زاویہ سے توجیہ وتشریح کرے (۳۶) سید صاحب نے مغربی مورخین کے اس زاویہ نظر کو مزید واضح کرنے کے لیے سر چارلس اومین کا یہ اقتباس بھی نقل کیا ہے:

> تاریخ، اسماء، سنین، واقعات کا رجسٹر نہیں جیسا کہ ایک عامی شخص خیال کرتا ہے بلکہ وہ نام ہے مورخ کے زاویہ نگاہ سے ان چیزوں کی توجیہ وتشریح کا اور چونکہ ہر مورخ کا سیاسی، اخلاقی وقومی زاویہ نگاہ ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف ہوگا اس لیے محال ہے کہ کسی زمانہ، کسی عنوان یا کسی شخص سے متعلق کوئی نام نہاد مستند تاریخ مرتب ہو سکے جو ہر طبقہ کے ناظرین کے ذوق کی تشفی کر سکے۔
>
> ایک عام آدمی ہمارے پاس ایک تاریخی استفسار لے کر آتا ہے بدقسمتی سے عموماً یہ ہوگا کہ ہم اس کے حسب توقع اسے کسی قسم کا کوئی مسلم وقطعی جواب نہ دے سکیں گے بلکہ ایک طرح کے پروپ گنڈا سے کام لیں گے جو ممکن ہے ہمارے نزدیک واقعیت کی صحیح ترجمانی ہو لیکن ہمیں تسلیم ہے کہ دوسروں کے نزدیک ممکن ہے وہ جواب خلاف واقعہ غلط اور فتنہ پرداز انہ ہو تاریخ کسی خارجی سے واقعات کی کسی فہرست کا نام نہیں، مورخ کا کام واقعات میں تسلسل اور ترتیب پیدا کرتا ہے اور دو مورخ جن کی قومیت و سیاست باہم مختلف ہے

واقعات کو اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے سے اس قدر مختلف شکلوں میں مرتب و مدون کر سکتے ہیں کہ پڑھنے والا انہیں ایک ہی سلسلہ واقعات کی ترجمانی سمجھ ہی نہیں سکتا...... غرض کہ ہم کو اس آدمی سے کہہ دینا پڑے گا کہ تاریخ واقعات کے متعلق ایک زاویہ نگاہ کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ ہر مورخ کا زاویہ نگاہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ......اور اس طرح افسوس ہے کہ تاریخ نگاری اب سیاسی، قومی و مذہبی پروپ گنڈے کے اہم ترین شعبہ کا نام رہ گیا ہے۔ (۳۷)

سر چارلس اومین کے خیالات اور اعتراضات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تاریخ کے سلسلہ میں مغربی مورخین نے کس قدر بیجا تصرف سے کام لیا، تاریخ کو انہوں نے سیاسیات ماضیہ کا حصہ قرار دیا اور تاریخ کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پروپ گنڈہ بنا دیا، سید صاحب نے مغربی مورخین کے اس رویہ پر سخت تنقید کی اور اسے ملعونیت کبری قرار دیا وہ لکھتے ہیں:

سر چارلس اومین اپنے ان خیالات میں منفرد نہیں تاریخ کو سیاسیات ماضیہ کا مرادف پروفیسر فریمین نے قرار دیا تھا جو پچھلی صدی میں انگلستان کے سب سے بڑے مورخ تسلیم کئے جاتے تھے۔ موجودہ تاریخوں کا سیاسی اغراض کے لیے لکھے جانے کا اعتراف ڈاکٹر شاوئیل نے بھی کیا ہے جو کولمبیا یونیورسٹی امریکہ میں تاریخ کے پروفیسر اور اس فن میں استاذ الاساتذہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان اعتراضات وتصریحات کی موجودگی میں قدامت پسند اہل مشرق اگر بجائے ہسٹورین آف ہسٹری آف دی ورلڈ (دنیا کے مورخین کی تاریخ) کیمبرج ماڈرن ہسٹری اور کیمبرج انڈین ہسٹری کی ضخیم و مرعوب کن مجلدات کے مطالعہ کے اپنا وقت بوستان خیال، طلسم ہوش ربا، داستان امیر حمزہ کی ورق گردانی میں صرف کرتے رہیں تو شاید ان پر تضیع وقت کا الزام عائد نہ ہو، جھوٹ کو جھوٹ کہہ کر ظاہر کرنا، تخیل آرائی کو افسانہ کے لباس میں پیش کرنا کسی مذہب میں معصیت

کبیرہ نہیں البتہ جھوٹ کو سچ کا نام دے کر، تعصبات کو واقعات کا رنگ دے کر اور
دروغ کو راستی بنا کر پیش کرنا وہ ملعونیت کبری ہے جس سے ہر فرد بشر کو جسے اپنی
دیانت، اپنا ایمان اور اپنی نجات عزیز ہے پناہ مانگتے رہنا چاہئے۔ (۳۸)

کیمبرج انڈین ہسٹری کا منصوبہ اور سید صاحب کا خدشہ:

انگریز مورخوں کے رویہ اور نقطہ نظر کی وجہ سے سید صاحب برگشتہ اور نالاں تھے اسی لیے وہ ان کی مورخانہ کوششوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

۲۲-۱۹۲۱ء میں کیمبرج یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ نے یہ تجویز منظور کی کہ کیمبرج ہسٹری کے نام سے ۷ رجلدوں میں ہندوستان کی ایک مفصل اور مبسوط تاریخ مرتب کی جائے سید صاحب نے معارف میں اس کا ذکر کیا اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ چونکہ اس سے پہلے کیمبرج ماڈرن ہسٹری کے نام سے یورپ کی تاریخ بارہ جلدوں میں مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہے اس لیے یہ مجوزہ تاریخ ہند کی تالیف بھی اسی نمونہ کے مطابق ہوگی وہ یقیناً مغرب کے زاویہ نظر سے مستند ہوگی لیکن مغرب جس زاویہ سے مشرقی علوم وفنون، تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت کو دیکھتا ہے اس کے بڑے تلخ تجربات ہیں۔ سید صاحب نے یہ بھی طنز کیا کہ اس تاریخ ہند کی تالیف کے لیے کیمبرج کو ایک بھی ہندوستان اہل قلم نہ مل سکا پھر بڑے لطیف پیرائے میں لکھتے ہیں:

> نیرنگ ساز فطرت کو شاید ابھی ایک بار اور اس تجربہ کی نمائش منظور ہے
> کہ عاشق کی داستان محبت کے بیان کرنے میں رقیبوں کی زبان دیانت،
> صداقت اور ایمانداری کہاں تک محفوظ رکھتی ہے (۳۹)

میجر بی۔ بی۔ ڈی باسو کی کتاب:

انگریز مورخوں کے برعکس صحیح نقطۂ نظر سے جب بھی کوئی تحریر یا کتاب سید صاحب

کے سامنے آئی تو انہوں نے اس کی بھرپور داد دی اور اس کی تعریف وتوصیف میں کوئی کمی نہیں کی۔ ۲۴-۱۹۲۳ء میں میجر بی۔ بی۔ ڈی باسو نے (Reseot the Christian Power in India) لکھی جس میں ہندوستان اور خاص طور سے بنگال میں یورپ کی عیسائی طاقتوں کے داخلہ، طریقہ کار، نشوونما اور ترقی واستیلا کی مفصل تاریخ لکھی اور ثابت کیا کہ یورپ نے ہندوستان کو ایمانداری سے فتح نہیں کیا بلکہ طاقت وقوت، چالاکی، ہشیاری، بدعہدی اور فریب کاری سے اپنے دام فریب میں گرفتار کیا (۴۰) ظاہر ہے انگریز مورخوں کے نقطۂ نظر سے یہ کتاب یکسر غلط تھی چنانچہ ٹائمس آف انڈیا کے مبصر نے ۲۷/جون ۱۹۲۴ کی اشاعت میں اس کتاب پر تبصرہ کیا اور میجر باسو اور ان کے نقطۂ نظر پر تنقید کی سید صاحب نے بھی اس پر اظہار خیال کیا اور لکھا کہ ''انگریز مورخین اور اہل قلم نے اپنی تبلیغی تاریخ نویسی کی تصویروں میں انگریزوں کو جس قدر ان کوششوں میں معصوم، نیک نیت، ایماندار، باوفا دکھانے کی کوشش کی ہے وہ تمام تر مصنوعی رنگ آمیزی ہے۔ (۴۱)

اس سلسلہ میں سید صاحب نے یہ بھی واضح کیا کہ انگریزوں کے قبضہ ہندوستان کی اصل تاریخ وہ نہیں ہے جو کل لکھی جا چکی ہے بلکہ وہ ہے جو کل لکھی جائے گی اور اس میں وہی مسالہ استعمال ہوگا جو انہوں نے سلطنت مغلیہ کی تاریخ کی ترتیب وتالیف میں استعمال کیا ہے اور میجر باسو قابل قدر ہیں کہ انہوں نے اس کا آغاز کر دیا ہے۔ (۴۲)

انگریز مورخوں کی مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش:

انگریز مورخوں نے تاریخ کے ذریعہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہی نفرت پھیلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی تاریخ میں بھی انہوں نے دانستہ ایسے جراثیم داخل کئے جن سے مسلمان فرقوں میں اختلاف وانتشار پیدا ہوا اور وہ متحد نہ ہوسکیں، وان کریمر کے مجموعہ مضامین کا ذکر اوپر آچکا ہے، عہد خلافت راشدہ کے متعلق انگریزوں کی تاریخوں کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

اس عہد اقدس کے متعلق محققین یورپ نے اپنی دانست میں جو تنقیدی تاریخیں لکھی ہیں ان کی اگر کورانہ تقلید کی جائے تو پھر مسلمانوں میں مخالفت کا طوفان اٹھ جائے گا اور اگر ان کی تاریخی تنقیدوں کی تنقید کی جائے تو اس کے لیے احادیث وسیر کی اصلی واقفیت کی ضرورت ہے اور یورپ کے معیاری اساتذہ تاریخ میں یہ جوہر گراں مایہ کمیاب بلکہ نایاب ہے۔(۴۳)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عہد خلافت راشدہ کی تعلیم کا ابتداءً اسی لیے انتظام نہیں کیا گیا کہ اس کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ دستیاب نہیں تھیں انگریزوں نے جو کتابیں لکھی تھیں ان سے خطرہ تھا کہ کہیں جنگ جمل اور جنگ صفین دوبارہ نہ چھڑ جائے اسی لیے صرف علامہ شبلی کے رسالہ بدء الاسلام کا ترجمہ آغاز اسلام پڑھایا جاتا تھا۔(۴۴)

بعض ہندو مورخین کی انگریزوں کی تقلید:

انگریز مورخوں کی ہم نوائی میں بعض ہندو مورخوں نے بھی قلم اٹھایا اور ان کی غلط بیانیوں کو مزید رنگ و روغن کے ساتھ پیش کیا سید صاحب نے ان ہفوات کی بھی تردید و تصحیح کی اور ہندو مورخین کو صحیح اور با مقصد تاریخ نویسی کی طرف متوجہ کیا اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انگریز مورخوں نے اپنے سیاسی مفادات کی خاطر تاریخ میں دانستہ خیانت و بددیانتی کی ہے اسے بڑھاوا دینے سے خودغرض انگریزوں کو فائدہ پہونچے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عداوت کی آگ پھیلے گی، ان کا اتحاد ناممکن ہوجائے گا اور وہ کبھی متحد ہوکر آزادی وطن کی کامیاب جدوجہد نہ کرسکیں گے۔

سید صاحب کی مسلسل اور متواتر کوششوں کے باوجود بعض ہندو مورخین، محققین اور اہل قلم انگریزوں کی سازش سے بچنے اور احتراز کرنے کے بجائے خود اس میں ملوث ہوگئے، سید صاحب رقمطراز ہیں:

''ہندوستان کی ان دونوں قوموں کے درمیان نفاق ڈالنے کی کوشش گو

تیسری قوم کی طرف سے شروع کی گئی مگر بہت جلد دوسری قوم نے اس کو اپنا کام بنالیا۔ (۴۵)

خاص طور سے آریہ سماجی تحریک کے رہنماؤں نے ملک میں اتحاد و اتفاق، قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی قائم کرنے کے بجائے اپنی قوم کو جنبش میں لانا ضروری قرار دیا اور مذہبی و سیاسی ہر طرح سے مسلمانوں کو نشانہ بنایا اور طرح طرح کے من گھڑت الزامات عائد کئے، ملک کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر سید صاحب نے اس کی مخالفت کی اور لکھا کہ:

''واقعات کی حیثیت سے نظر کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہندو اکابر نے اپنی قوم کو جنبش اور حرکت میں لانے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ قوم کے نفرت و عداوت کے جذبات کو مشتعل کیا جائے اور اس کے لیے مسلمانوں کو منتخب کیا ان کا فاتحانہ جرم اقدام اس کے لیے بہترین مسالہ پیدا کرسکتا ہے اس طرح مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مواد یکجا کیا گیا اور اس کو تمام ملک میں ہندوؤں کے درمیان پھیلایا گیا مذہبی حیثیت سے سوامی دیانند جی نے اور سیاسی حیثیت سے تلک مہاراج نے مسلمانوں کے خلاف ایک جہاد عظیم کا سامان فراہم کیا تمام ملک میں ستیارتھ پرکاش کی تبلیغ کی گئی جس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر ممکن دلیل سے ہندو قوم کو آمادہ جنگ کیا گیا۔ بڑے سے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قریوں تک میں آریہ سماج کا جال پھیلایا گیا ان کے ہفتہ وار اور سالانہ جلسوں میں مقررین کا بہترین موضوع اسلام اور مسلمانوں کو برا بھلا کہنا، مسلمان سلاطین کے جھوٹے مظالم گنانا اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکانا قرار دیا گیا ان کے اخبارات و رسائل اور کتابوں میں باقاعدہ اسلام، بزرگان اسلام، انبیائے اسلام اور سلاطین اسلام کے خلاف سب وشتم کا سلسلہ قائم کیا گیا اور اس طرح ملک کے طول وعرض میں مسلمانوں

کے خلاف ایک وسیع تنظیم کھڑی کی گئی۔

تلک مہاراج نے عام ہندوؤں اور خصوصاً مہاراشٹر کے بہادروں کے مردہ جذبات میں نئی امنگ پیدا کرنے کے لیے شیواجی اور عالمگیر کی مری ہوئی ہڈیوں کو اکھاڑنا شروع کیا، شیواجی کو قومی ہیرو بنایا گیا اس کے مقابل میں عالمگیر کو ہر ظلم اور برائی کا قصوروار ٹھہرایا گیا، واقعات گھڑے گئے تاریخیں بنائی گئیں، جعلی تحریریں بنانے کے کارخانے قائم کئے گئے، جھوٹے افسانے ناٹک اور ناول لکھے گئے ان کے دارالاشاعت قائم ہوئے تھیٹروں اور تماشہ گاہوں میں ان کی نقلیں دکھائی گئیں اور یہ سلسلہ مراٹھی زبان سے شروع ہوکر گجراتی اور بنگالی زبانوں تک پھیل گیا اور اس زہریلے لٹریچر نے تمام ہندو نوجوانوں کے دل ودماغ کو مسموم کردیا اور اس طرح ملک میں اب تک یہ نظام عمل پوری طرح قائم اور جاری ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندو اہل قلم نے قصداً ایسی کتابیں اور تحریریں لکھیں اور اب تک لکھ رہے ہیں اور اس کام میں انگریز اہل قلم نے بھی ان کی پوری مدد کی بلکہ رہنمائی کی جن میں مسلمانوں کے عہد حکومت کو ہر طرح بدنام کرنے کی کوشش کی اور مسلمان سلاطین پر غلط الزامات قائم کئے اور ہندوؤں پر ان گنت مظالم کو سلیقہ کے ساتھ اوراق میں ترتیب دے کر ان کو مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا جس کے ذریعہ سے تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں کے خیالات مسلمانوں کی طرف سے ہمیشہ کے لیے خراب کردیئے گئے۔(۴۶)

سید صاحب نے آریہ سماجی مورخین کے جارحانہ رویہ کی مذمت کرتے ہوئے اس کے نقصانات سے بھی آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ وہ اپنے رویہ میں تبدیلی لائیں، ۱۹۲۰ء میں جب وفد خلافت کے ساتھ وہ یورپ جارہے تھے تو افریقی بندرگاہ مصوع پر مشہور آریہ سماجی رہنما لالہ لاج پت رائے سے ان کی ملاقات ہوئی سید صاحب نے ان کے سامنے بھی یہ

بات رکھی کہ آریہ سماجی تحریک کی گذشتہ پالیسی میں اب انقلاب کی ضرورت ہے تا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کے بجائے اتفاق پیدا ہو لالہ جی نے بھی اس سے اتفاق کیا (۴۷) مگر جب انہوں نے مالوی جی کے اشارہ سے مذہبی آزادی کے متعلق ترمیمی بل کو تعویق میں ڈالنے کی کوشش کی تو سید صاحب نے نہایت افسوس کے ساتھ لکھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مصوع کی باتیں ان کے ساتھ سمندر سے پار ہندوستان نہ آسکیں (۴۸)

غلط تاریخ نویسی کا نتیجہ:

انگریزوں اوران کے متبع مورخین کی غلط تاریخ نویسی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظم شر انگریزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت وعداوت اور ناچاقی انتہا کو پہونچ گئی اور ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تحریک خلافت اور ترک موالات نے ہندو مسلم اتحاد کی جو فضا قائم کی تھی وہ بھی باقی نہ رہی ایک بار پھر ہندو مسلم نزاعات و اختلافات کے خاتمہ کی کوشش شروع کی گئی تو سید صاحب نے اس میں حصہ لیا اور لکھا کہ:-

> ہمارے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی نزاع اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی جب تک دونوں قومیں ۱۸۵۷ء کے خاتمہ پر اپنے فاتحانہ اور مفتوحانہ جذبات سزا اور انتقام کو ختم نہ کردیں اور تیسری قوم کی غلامی کے عہد سے اپنی تاریخ کا نیا دور نہ شروع کردیں جس میں گذشتہ آٹھ صدیوں کے تلخ واقعات کی یاد قطعاً موقوف کردی جائے اور مستقبل کی اصلاح و درستی کی خاطر حال کو ماضی کی تکرار میں برباد نہ کیا جائے، ہر حکومت کی تاریخ میں اچھے اور برے منصفانہ اور ظالمانہ دونوں قسم کے واقعات ملتے ہیں اس کلیہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ بھی خالی نہیں مگر ملک کی بھلائی اس میں نہیں ہے کہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مسلمانوں کی حکومتوں کی کچھ واقعی اور کچھ گھڑ کر

مفروضہ افسانے یکجا کیے جائیں، اور وہ انجمنوں کے جلسوں میں لڑکوں کے
درسوں میں ، مطالعہ کی کتابوں میں اخبارات کے کالموں میں روزمرہ کی
گفتگوؤں میں کھیل اور تماشے کے ناٹکوں میں اس طرح بار بار دہرائے جائیں
کہ وہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جائیں اور دونوں قوموں کے درمیان ایک غیر مختتم
تلخی اور ناگواری اور بدگمانی اور عداوت راسخ ہو جائے (۴۹)

اپنے وسیع مطالعہ ومشاہدہ اور تجربات سے سید صاحب کو یقین کامل تھا کہ ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور میل ملت کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غلط تاریخ نویسی اور پروپ گنڈا بند کیا جائے اور تاریخ میں ایسے واقعات لکھے جائیں جن سے دونوں قوموں میں ربط وتعلق ، ہم آہنگی اور خوش گوار تعلقات پیدا ہوں وہ لکھتے ہیں :-

اگر ہم ہندو اور مسلمانوں کے نزاعات کا واقعی خاتمہ کرنا چاہتے ہیں اور
اس بدنصیب ملک میں خون کی ندیوں کے بدلے جوئے محبت بہانا چاہتے ہیں تو
اس کا اصل علاج یہ ہے کہ آریہ ساجی روش میں تبدیلی کی جائے اسلام اور
مسلمانوں کے خلاف جو تبلیغ اور پروپ گنڈا پورے نظام کے ساتھ تقریروں،
تحریروں، کتابوں، رسالوں، اخباروں، تماشوں، ناٹکوں، افسانوں اور تاریخوں
کے ذریعہ پھیلایا جارہا ہے ان کو یک قلم بند کیا جائے...... آریہ ساجی مقررین،
محررین اپنے بیانوں اور گفتگوؤں کا موضوع اپنے مذہب کی خوبیوں اور
اچھائیوں کو قرار دیں اور دوسرے مذاہب کو اپنے سب وشتم کا نشانہ نہ بنائیں
اور اسی طرح ہندو اور مسلمان اہل قلم تاریخ ہند کے اسلامی دور کے وہ واقعات
تلاش اور یکجا کریں جن سے دونوں میں مصالحانہ روح کی ترقی ہو (۵۰)

ٹائمز آف انڈیا کے ایک مضمون نگار بینکر صاحب نے ہندو مسلم فسادات کے اسباب کے سلسلے میں لکھا کہ سلطان محمود اور اورنگزیب کی جو نفسیات تھیں وہی سچے مسلمان

کی نفسیات ہیں انہوں نے مولانا محمد علی جوہؔر اور سیف الدین کچلو وغیرہ کے بعض بیانات کے حوالے سے بتایا کہ مسلمانوں کا اصل مقصد در پردہ دارالحرب ہندوستان کو دارالاسلام بنانا ہے، سید صاحب نے ان کے محققانہ تفردات پر سخت تنقید کی اور لکھا کہ:

> مسٹر بینکر نے اس مضمون کے ذریعہ سے مسلمانوں کی قومی و مذہبی ذہنیت ونفسیات کی تحقیق و انکشاف میں بے فائدہ محنت کی اگر چہ سچ ہے کہ معلول سے علت کا وجود مقدم ہوتا ہے تو ان کو تحقیق کرنا چاہئے کہ واقعات کے مقدم و تاخر کی کیا صورت ہے اس مضمون سے خود ہم سایہ قوم کی نفسیات و ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتک سلطان محمود اور اورنگزیب کو نہیں بھولی ہے اس لیے جو کچھ ہو رہا ہے وہ تلافی ما فات نہیں بلکہ سابق کی انتقام طلبی کے مظاہر ہیں اور اس طرح قیامت تک ہندو مسلم اتحاد کی عمارت کی تعمیر نہیں ہوسکتی اس کی تعمیر کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ گذشتہ عہد کی فاتح ومفتوح دونوں قومیں اپنے موجودہ عہد کی یکساں مفتوحیت کو سامنے رکھ کر پرانے جذبات کو فراموش کریں اور نئے عہد کے نئے جذبات کا آغاز کریں (۵۱)

آریہ سماجی تحریک ہندو مسلم منافرت کو مسلسل ہوا دیتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بھی اس اشتعال انگیزی کا کسی قدر جواب دینے لگے مگر انہوں نے اس کے لیے کوئی تنظیم قائم نہیں کی اور نہ ہی تحریروں اور تقریروں کا کوئی منصوبہ بنایا، مسلمانوں نے جو کچھ کیا اسے سید صاحب نے ان کی مجبوری اور مدافعانہ کوشش قرار دیا (۵۲)

انگریزوں کی غلط تاریخ نویسی ، اس کے اسباب وعلل، بعض ہندو مورخین کی انگریزوں کی تقلید اور اس کے مضمرات ونقصانات کے سلسلہ میں سید صاحب کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے بعد ان چند تاریخی واقعات کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے جن میں دانستہ یا نادانستہ بعض ہندو، مراٹھی، بنگالی اور گجراتی زبان کے مورخین نے غلط بیانیوں سے کام لیا اور جن کی سید صاحب نے تردید وتصحیح کا فریضہ انجام دیا۔

اورنگ زیب عالمگیر:

مسلمان حکمرانوں میں عالمگیر اور اس کے عہد حکومت کو انگریز مورخوں نے سب سے زیادہ مجروح و مطعون کیا اور اس پر متعدد الزامات عائد کئے، بت شکن اور ہندو کش تو گویا اس کا لقب ہی قرار پایا۔

عالمگیر پر عائد ہر طرح کے الزامات کی علامہ شبلی نعمانی نے اپنے رسالہ ''اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر'' میں مکمل تردید کردی ہے (۵۳) واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کی تردید کے بعد مزید کسی اعتراض کی گنجائش غالباً باقی نہیں رہ جاتی اس کے باوجود سید صاحب کے زمانہ میں عالمگیر پر کچھ نئے اور کچھ پرانے ہی الزامات کو دہرایا گیا سید صاحب نے بحیثیت مورخ ان کا نوٹس لیا اور ان کے جوابات دیئے۔

مشہور مورخ سرجدوناتھ سرکار نے فرامین عالمگیر نام کے کسی مجموعہ کی بنیاد پر اپنے ایک مضمون میں عالمگیر کو ایک خوش جمال کنیز پر فریفتہ ہونے اور عشق میں غش کھا کر گر جانے کا انکشاف کیا سید صاحب نے معارف میں اس مضمون کا ذکر کیا اور لکھا کہ عالمگیر کو اس کے دوست و دشمن اور مشرقی و مغربی تمام مصنفین زہد پیشہ اور متقی جانتے ہیں مگر سرکار اس کے حسن و عشق کی داستان سناتے ہیں (۵۳)

عالمگیر اور شیواجی کا موازنہ و مقابلہ انگریز مورخین اور بعض ہند و اہل قلم کا بڑا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ انگریزوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عالمگیر نے شیواجی کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا علامہ شبلی نے اس موضوع پر بھی بڑی محققانہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ شیواجی کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ اس کی حیثیت سے بڑھ کر تھا (۵۴) اس کے باوجود انگریز مورخوں کی تقلید میں بعض ہندو مورخوں کا یہ ایک اہم موضوع رہا، یہاں تک کہ انہوں نے شیواجی کو ایک قومی ہیرو اور مراٹھوں کا رہنما بنا کر پیش کیا اور باقاعدہ اس کی برسی بھی منائی جانے لگی سید صاحب نے ان واقعات پر معارف میں ایک طویل شذرہ

لکھا جس میں نہ صرف غلط تاریخ نویسی پر تنقید کی بلکہ اس کے مضمرات سے بھی آگاہ کیا اور شیوا جی کی صحیح تصویر بھی پیش کی سید صاحب لکھتے ہیں:

شیوا جی کا جشن پیدائش امسال ہر جگہ بڑی دھوم دھام سے منایا گیا ہمارا صرف یہ کہنا ہے کہ کاش یہ شیوا جی کی پیدائش کا جشن منانے والے شیوا جی کے عہد میں ہوتے اور اس کی قزاق فوج کے کارنامے اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کم از کم ایک دفعہ خود اس کی تاخت وتاراجی کا ذاتی تجربہ رکھتے اور چوتھ کی مصیبت میں گرفتار ہوتے آج ہندو جشن منا رہے ہیں لیکن ان کو یاد رہے کہ کل جب کہ یہ مہاراشٹری موئیرے تمام ہندوستان کو لوٹتے پھرتے تھے ان کی لوٹ میں ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی اور نہ دیر وحرم اور بت خانہ ومسجد کا امتیاز تھا، آج سمجھ بوجھ اور تعلیم وتربیت کے اثر سے متاثر ہوکر مرہٹہ برہمن اپنے ہیرو کے دامن سے یہ داغ مٹانا چاہتے ہیں لیکن تاریخ کے دفتر کیونکر خون کے دھبوں سے پاک ہوسکتے ہیں۔ اس لیے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک مدت سے پونہ کی مرہٹی تاریخی انجمن کاغذات دستاویزات اور رجال کی تاریخی کتابوں اور خطوط کے بنانے کا نہایت مجرمانہ کام انجام دے رہی ہے جن کے مطابق شیوا جی کو ہندو قوم کا ایک مصلح ہیرو اور نیک خیال کشور کشا اور متمدن بنایا جارہا ہے مگر۔

ایں خیال است ومحال است جنوں

جو لوگ شیوا جی کو ہندو قوم کا ہیرو اور اس کی جدوجہد کی اصل منشا خاص مسلمانوں کو ہلاک وبرباد کرنا قرار دیتے ہیں درحقیقت وہ تاریخ سے ناواقف ہیں یا تاریخ سے کھیل کرتے ہیں مرہٹوں کی حکومت کی بنیاد ایک جاگیر سے شروع ہوتی ہے۔ بیجاپور کے مسلمان بادشاہ عادل شاہ نے پونہ اور سوپہ دو پرگنے شیوا کے باپ کو عطا کئے تھے یہی جاگیر تھی جس پر شیوا جی نے اپنی حکومت تعمیر کرنی چاہی۔ کیا یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ ایک مسلمان بادشاہ نے اسلام کی تباہی

کے لئے خود اپنے دشمن کے ہاتھ میں ہتھیار دیدئے تھے اور اگر یہ حقیقت ہے تو
شیوا اور اس کا خاندان کس درجہ اخلاق سے گرا ہوا تھا کہ جس نے اس کو اورنگ
نشیں بنایا اسی کی تباہی و بربادی کا اس نے سامان کر کے محسن کشی کے بدترین جرم
کا ارتکاب کیا ہے۔(۵۵)

جزیہ اور چوتھ:

جزیہ کی بحث ہندوستان کی مسلم تاریخ میں خاص طور سے چھیڑی گئی تا کہ ہندؤں
کو مسلمانوں سے برگشتہ کیا جائے اس کے متعلق تمام الزامات کی علامہ شبلی نے مدلل تردید
کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ جزیہ کوئی ظالمانہ ٹیکس نہ تھا بلکہ وہ غیر مسلموں کے حق میں ایک
رحمت تھا۔(۵٦)

دھولیا (خاندیش) کے ایک اسکول کے مدرس مولوی شمس الدین صاحب نے
علامہ شبلی کے رسالے الجزیہ کا مراٹھی زبان میں ترجمہ کیا جو مراٹھی شکشک میں شائع ہوا اس
کے جواب میں ایک مرہٹہ اہل قلم بیڑے کر صاحب نے ایک مضمون لکھا جس میں یہ دکھایا
کہ ''جزیہ مسلمانوں کا ایک قابل نفرت فعل ہے۔'' اور اس کے مقابلہ میں شیوا جی نے
مما لک مفتوحہ پر جو چوتھ لگائی تھی وہ قابل اعتراض نہیں ہے۔(۵۷)

علامہ شبلی کے رسالہ الجزیہ پڑھنے کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جزیہ مسلمانون
کا قابل نفرت فعل ہے تو اس سے اس کے مبلغ علم وعقل اور اس کی متعصب ذہنیت کا
اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے بیڑے کر کے اس مزعومہ کی بھی تردید
کی اور لکھا کہ بیڑے کر صاحب نے مما لک مفتوحہ کے بجائے مما لک مغنومہ کا لفظ اگر
استعمال کیا ہوتا تو ہمیں کوئی عذر نہ ہوتا۔ اور چوتھ کے بارے میں یہ سخت فقرہ لکھا کہ'' جو
اپنے پیشے کے لحاظ سے کل کا حقدار ہو چکا ہو اگر وہ چوتھا حصہ لے کر ۳/۴ حصہ انسانوں کو بخش
دے وہ قابل نفرت نہیں۔''(۵۸)

بیڑے کر صاحب نے یہ فرض انکشاف بھی کیا تھا کہ شیوا جی نے ایک خط لکھ کر عالمگیر کو جزیہ کے نقائص سے آگاہ کیا تھا اور اس کے لئے مرٹھی زبان کی ایک کتاب ''مسلمانی ریاست'' سے حوالہ دیا تھا سید صاحب نے اس کتاب کی قدر و قیمت مرہٹی داں اہل علم سے معلوم کی تو پتہ چلا کہ وہ ایک ہندو مصنف کی ایک معمولی کتاب ہے جس میں افسانوں اور حکایتوں سے استناد کر کے شیوا جی کی مداحی اور عالمگیر کی برائی کی پوری داستان لکھی گئی ہے۔(۵۹)

متعدد ٹیکس ختم کرنے کے بعد عالمگیر نے جزیہ نافذ کیا تھا چنانچہ اس کا ایک پورا نظام بھی قائم کیا تھا مثلاً جزیہ کس کس سے لیا جائے گا اور اس کی قیمت کیا ہوگی، کن لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا جن لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا یا معاف کر دیا جاتا تھا ان کو معافی جزیہ کی سند دی جاتی تھی تاکہ ان سے جبری وصولی نہ ہو سکے، سید صاحب کو لال چندر کی کتاب نگارنامہ ہاتھ آئی جس میں اور باتوں کے علاوہ معافی جزیہ کی سند لکھنے کا طریقہ بھی درج تھا چنانچہ سید صاحب نے اسے معارف میں شائع کیا اور اس کے ابتدائیہ میں یہ وضاحت کی کہ

> ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں غیر مسلم ذمی رعایا سے جزیہ کے نام سے جو ٹیکس وصول ہوتا تھا اس کی نسبت انگریز مورخوں نے اور ان کی دیکھا دیکھی ہندو مصنفوں نے جو بے سرو پا باتیں پھیلا رکھی ہیں ان کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے اب ہم کو ایک نئی دستاویز ہاتھ آئی ہے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ یہ کوئی ایسا ٹیکس نہ تھا جو ظلم سے لگایا جاتا تھا اور کبھی معاف نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسے لوگوں سے جو غریب ہوتے تھے عموماً معاف کر دیا جاتا تھا بلکہ ہندوستان کے عام کاشتکاروں سے جو زیادہ تر غریب طبقہ ہے اکثر معاف کر دیا جاتا تھا۔(۶۰)

عالمگیر پر اور الزامات کے ساتھ علم دشمنی کا بھی الزام عائد کیا گیا جس کی سب سے پہلے علامہ شبلی نے تردید کی پھر سید صاحب نے بھی متعدد مقامات پر اس الزام کے رد

وابطال کا فریضہ انجام دیا۔

سید صاحب کو جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں عہد عالمگیر کی دو کتابیں مت اچھرہ اور ردالکفر ہاتھ آئیں ان کے تعارف پر ایک مضمون ''ہندوکش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں'' (۶۱) کے عنوان سے لکھا اور خود ان کتابوں کو عالمگیر کے اوپر غلط الزام کا ثبوت قرار دیا، وہ لکھتے ہیں:

> عالمگیر کے مخالفین اسے ہندوکش علوم وفنون کا برباد کرنے والا، ہندو مذہب کو برباد کرنے والا اور ہندؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والا ثابت کرتے ہیں مگر دوسری دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ اور خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دے رہی ہیں کہ اس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزامات تہمت ہیں۔(۶۲)

عالمگیر کی مندر شکنی کے واقعات ہر مورخ کے نوک قلم پر ہے مگر اس کی مندر نوازی کے واقعات کو عموماً نظر انداز کیا گیا حالانکہ اس نے متعدد مندروں کو جاگیریں اور ان کے مہنتوں کو قیمتی خلعتیں بھی عطا کی تھیں اسی طرح کا ایک واقعہ اخبارات میں شائع ہوا کہ عالمگیر نے ضلع پربھنی (دکن) کے ایک بڑے مندر کے پجاری کو ایک قیمتی مرصع پگڑی عنایت کی تھی ۱۹۳۶ء میں اس پگڑی کی قیمت کا اندازہ پندرہ ہزار کا تھا وہ مندر سے چوری ہوگئی اس کے ساتھ عالمگیر کی دی ہوئی سندیں بھی تھیں پولس نے اپنی تحقیقات سے چوروں کا پتہ لگا کر یہ اشیاء برآمد کرلیں سید صاحب نے اس واقعہ کا ذکر معارف میں کرتے ہوئے یاد دلایا کہ عالمگیر کے متعلق صرف یہ یاد ہے کہ وہ ظالم بت شکن اور ہندوکش تھا مگر دیکھو کہ آج اس کی فیاضی کی بدولت کتنے ہندو مندر آباد ہیں (۶۳)

شیوا جی کی برسی کا جواب:

شیواجی کی برسی منانے کے ردعمل میں بعض مسلمانوں نے عالمگیر کی برسی منانے

کا ارادہ ظاہر کیا اور سید صاحب سے عالمگیر کی صحیح تاریخ ولادت و وفات دریافت کی،
سید صاحب نے اسے پسند نہیں کیا اور انہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی اور لکھا کہ:

> آریہ ہندوؤں نے جابجا خاص طور سے اپنے ان بہادروں کی برسی منانے
> کی کوشش کی ہے جنہوں نے اسلامی سلطنتوں کا کامیاب مقابلہ کیا ہے ہندوستان
> کا کوئی عاقل باشندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرے ہوئے بادشاہوں اور مٹی ہوئی
> حکومتوں کے خلاف ملک میں نفرت کے جذبات پیدا کرنے سے اس ملک کی
> موجودہ صورت حال کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے بجز اس کے کہ اپنے مسلمان
> ہمسایوں کی دل آزاری مقصود ہو مسلمانوں نے بھی اس کا جواب دینے کی کوشش
> کی چنانچہ اس سال سندھ اور بعض ملحقہ علاقوں میں محمد بن قاسم ثقفی کی برسی
> بڑی دھوم دھام سے منائی گئی، اس کے جواب میں وہاں کے مسلمان محمد
> اورنگزیب عالمگیر کا عرس کرنے کا تہیہ کررہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم آئے شگون
> پر ناک کٹانے کا مشورہ نہیں دے سکتے، مسلمانوں میں مذہبی بزرگوں کے عرسوں
> کی کیا کمی تھی کہ اب سیاسی عرسوں کا بھی آغاز کیا جائے اور جو آگے چل کر
> بہرحال مذہبی حیثیت اختیار کرلیں گے اس نقالی سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ
> پہونچے گا بلکہ الٹا اس سے انکے مذہب میں نئی بدعات کا آغاز ہوگا۔ (۶۴)

شہزادی روشن آراء:

بعض ہندو مرہٹہ اور بنگالی افسانہ نگاروں نے تیموری بیگمات کے فرضی عشق و
محبت کے واقعات قلمبند کئے چنانچہ بمبئی میں ایک ناٹک میں اکبر کی فرضی بیٹی مہرالنساء کو
دکھایا گیا جو ایک راجپوت پر عاشق ہوجاتی ہے (۶۵) اس کے بعد ایک مرہٹی افسانہ نگار
نے یہ قصہ گھڑا کہ روشن آراء شیواجی پر دل و جان سے عاشق ہوگئی تھی اور اسی محبوبہ مغل حرم
کی کوشش سے شیواجی نے دلی کی نظربندی سے نجات پائی اور ساتھ میں اپنی شیدا کو بھی

اپنے مہاراشٹر کے پہاڑی قلعہ میں لے آیا(۶۶)

ان فرضی واقعات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بس اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے تاریخی واقعات کو کس قدر مجروح کیا اور ان سے کس قسم کے مقاصد حاصل کرنے چاہے۔

گلنار بیگم:

اس قسم کے افسانوں میں عالمگیر کی بیوی گلنار بیگم کو بھی ایک کردار بنایا گیا، بنگالی اہل قلم ہیم چندر رائے ایم۔اے نے اپنے ایک مضمون میں جو امرت بازار پتریکا مورخہ ۹رستمبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا روشن آراء اور شیواجی کے فرضی واقعہ کے ساتھ عالمگیر کی بیوی گلنار بیگم کے بارے میں لکھا کہ راجہ جسونت سنگھ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کے ساتھ عالمگیر نے جو برتاؤ کیا وہ دراصل گلنار بیگم اور رانی کی باہمی عداوتوں اور گلنار بیگم کی فرمائشوں کا نتیجہ تھا سید صاحب نے اس قیاس کو غلط بتایا اور یہ چبھتا ہوا فقرہ لکھا کہ" عالمگیر سا بادشاہ جس کو ہر مورخ مستقل مزاج اور خود رائے کہتا ہے وہ ہیم چندر رائے کی تحقیق میں زن مرید تھا۔(۶۷)

زن مرید ثابت کرنے سے تسلی نہیں ہوئی تو گجراتی ہیڈ ماسٹروں نے اس واقعہ کے بالکل برعکس گلنار بیگم کے عشق کی کہانی لکھی، گجراتی ہیڈ ماسٹروں نے طلبہ کے لیے سمود سنگرہ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی اس کی تیسری جلد میں لکھا کہ عالمگیر کی ارمینین بیوی گلنار بیگم، درگا داس پر جو عالمگیر کے یہاں قید تھا عاشق ہوگئی تھی اور عشق ہی میں چھپ کر قید خانہ گئی اور چاہا کہ درگا داس کو ڈرا دھمکا کر اپنی محبت پر راضی کرلے مگر بہادر راجپوت نے صاف جواب دے دیا اور اس ننگ کو گوارا نہ کیا، گلنار بیگم ابھی وہیں تھی کہ اس کا بیٹا شہزادہ کام بخش آگیا چنانچہ گلنار بیگم نے شہزادہ کو حکم دیا کہ وہ درگا داس کو قتل کردے کام بخش نے ابھی تلوار اٹھائی ہی تھی کہ عالمگیر کا سپہ سالار دلیر خاں قید خانہ آپہونچا اور اس گفتگو

کو سن کر کام بخش کو ملامت کی اور بہادر راجپوت کی شرافت سے متاثر ہو کر اسے رہا کر دیا اور اپنی حفاظت میں راجپوتانہ بھیج دیا۔ (۶۸)

سید صاحب نے اس واقعہ کو فرضی، گھڑا ہوا اور عقل سے پرے قرار دیا اور لکھا کہ:

> درگا داس جو جسونت سنگھ والئی جودھ پور کا ملازم تھا اس کی صوبہ داری کابل کے زمانہ میں اس کے ساتھ تھا اور جو کابل میں اس کے مرنے کے بعد اس کے دونوں بیٹوں کو لے کر بادشاہی اجازت کے بغیر راجپوتانہ بھاگا تھا اور جس نے اکبر کو بغاوت پر آمادہ کر کے اور اس کو ساتھ لے کر مرہٹہ کے پاس چلا آیا تھا وہ کبھی گرفتار ہی نہیں کیا گیا، گلنار بیگم اورنگزیب کی مدخولہ کنیز کا نام تھا جو کام بخش کی ماں تھی، گلنار کو بعض یورپین سیاحوں نے ارمنی بتایا ہے۔ بعض نے اودے پوری لکھا ہے بہر حال کوئی بھی ہو کیا کوئی بے غیرت سے بے غیرت عورت یہ کر سکتی ہے کہ اس قسم کے ناجائز تعلق کے بیچ اپنے جوان لڑکے کو واسطہ بنائے پھر ایسی حالت میں کہ کام بخش اس کا لڑکا پورا جوان ہو چکا ہو اس کی ماں کی عمر چالیس سے کیا کم ہوگی۔ کیا اس سن وسال کی عورت عشق کے سودائے خام میں گرفتار ہو سکتی ہے اور کیا اورنگزیب سا واقف کار کبھی گلنار کے اس فقرے کو تسلیم کر سکتا ہے کہ مجھے شہنشاہ کی پروانہیں وہ خود میرے حکم کا غلام ہے۔(۶۹)

اس فرضی واقعہ کی تردید کے بعد سید صاحب نے ہندو مرہٹی اور بنگالی اہل قلم سے یہ سوال کیا کہ:

> اس قسم کے بے اصل اور بے بنیاد مضامین کی اشاعت سے ہندو مرہٹی، گجراتی اور بنگالی انشا پردازوں کا مقصود کیا ہے اگر صرف اپنی خیالی انشا پردازی کا زور قلم دکھانا ہے تو اس کے لیے جاندار مخلوقوں کے بجائے جو گو اس وقت مردہ ہیں بے جان مخلوقات کی طرف سے مکالمہ زیادہ مناسب ہے کہ نہ وہ خود جواب

دینے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ کوئی ان کی حمایت میں زبان کھولے گا اور اگر
تاریخی واقفیت کا اشتہار مقصود ہے تو ابھی خالص ہندوستان کی خاک میں اس
جوہر کے پیدا ہونے کے لیے زمانہ درکار ہے پھر اس مکالمہ کو افسانہ کہا جائے یا
تاریخ کیا ہمارے ہندو اہل قلم یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح اپنی تاریخ کو انہوں
نے خرافات کہن بنالیا ہے اسلامی تاریخ کو بھی اس درجہ پر لے آئیں۔(۷۰)

سیرت نبویؐ پر تنقید:

مسلمان سلاطین اور حکمرانوں سے گزر کر مرہٹی مورخوں نے حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کو بھی ہدف تنقیص بنایا مرہٹی انسائیکلو پیڈیا (جلد ۱۶) شائع ہوئی تو اس میں حضور اکرم ﷺ کے متعلق نہایت ناروا اور گستاخانہ باتیں لکھی گئیں فطری طور پر سید صاحب نے اس کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کی اور اس کی نشاندہی کے ساتھ اس کے چند فقرے نقل کئے تو بمبئی اور بعض دوسرے شہروں کے اخبارات نے بھی سید صاحب کی تائید کی جس کا نتیجہ مسلمانوں کی سخت برہمی کی صورت میں ظاہر ہوا حتی کہ انسائیکلو پیڈیا کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر کیتکر نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور دوسرے ایڈیشن میں وہ صفحات نکال دینے کا وعدہ کیا۔(۷۱)

حقیقت یہ ہے کہ افسانوں اور ڈراموں کے ذریعہ ان کو یقینی واقعات ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی تھی اور جب کوئی حقیقت نگار مورخ ان کی تردید کرتا اور انہیں غلط بتاتا تو اسے افسانہ اور ڈرامہ قرار دے کر پہلو اس طرح بچالیا جاتا کہ یہ تاریخی واقعات نہیں بلکہ افسانے اور ڈرامے ہیں، سید صاحب نے بنگالی اور مرہٹی افسانہ نویسوں اور ڈرامہ نگاروں کی ان اوچھی حرکتوں پر بڑا دلچسپ تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

شترمرغ آپ جانتے ہیں ایک عظیم الجثہ پرندہ ہے اس کی نسبت فارسی
میں ایک قصہ ہے کہ جب ایک ایرانی شکاری نے اس کو پرندہ سمجھ کر شکار کرنا چاہا

تو اس نے کہا کہ میں تو شتر (اونٹ) ہوں اور جب اس کو اونٹ سمجھ کر اس نے اپنا اسباب لادنا چاہا تو اس نے معذرت کی کہ میں تو مرغ ہوں اسباب لادنا میرا کام نہیں، بعینہ اسی طرح یورپ نے تاریخی افسانہ کے نام پر ایک علمی شترمرغ خلق کیا ہے ناظرین کے سامنے اس کو پیش کیا جاتا ہے یا یقین پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ سرتا پا تاریخی ہے اور جب آپ اس پر تاریخی حیثیت سے اعتراض کرینگے کہ اس کے یہ مندرجات واقعات اصلیت سے خالی ہیں تو جواب ملے گا کہ یہ تو افسانہ ہے اس میں تاریخ سے تطبیق کی تلاش کیوں ہے؟ یورپین افسانہ نوسیوں نے اسی طریقہ تحریر کے ذریعہ سے ترکوں کی اخلاقی اور خانگی زندگی کی یورپ میں بدترین تشہیر کی ہے اور اب اسی قسم کا پروپگنڈا ہندوستان کے مسلمان سلاطین کے خلاف یوروپین افسانہ نویسوں کے بہترین مقلد بنگالی، مرہٹی اور گجراتی افسانہ نویس پھیلا رہے ہیں کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ اس طریقہ سے ملک یا علم کس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ (۷۲)

سید صاحب نے ملکی وقومی مفادات کے پیش نظر ان فساد پیشہ مورخوں کو یہ مشورہ دیا کہ منافرت، کشمکش اور تلخ واقعات کے بجائے تاریخ میں ان واقعات کا انتخاب کریں جو ملک کی دو بڑی قوموں میں میل ملاپ اور اتحاد پیدا کریں اور یہی اس ملک کی سب سے بڑی خدمت ہوگی (۷۳) سید صاحب کے مشوروں پر عمل کیا گیا ہوتا تو شاید بعد میں پیش آنے والے بعض سیاسی وسماجی واقعات کی نوعیت کچھ اور ہی ہوتی۔

تاریخ اسلام کی تدوین کا منصوبہ:

مذکورہ بالا غلط تاریخ نویسی اور اس کے مضمرات کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ تاریخ اسلام اور تاریخ ہندوستان کے موضوع پر مستند ومعتبر کتابیں لکھی جائیں جن میں سیاسی واقعات کے ساتھ تہذیب وتمدن کے واقعات کی عکاسی بھی کی جائے سید صاحب

نے اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے خاص طور سے تاریخ اسلام کی تدوین کو دارالمصنفین کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا (۴۷) اسلامی علوم وفنون کی تاریخ بھی ان کے پیش نظر رہی۔

دارالمصنفین کے کاموں کا جب باقاعدہ آغاز ہوا تو سید صاحب خود تو اپنے جلیل القدر استاد مرحوم کی وصیت کے مطابق سیرۃ النبی کی تالیف وتصنیف میں منہمک ہوئے لیکن اپنے رفقاء کو صحابہ کرامؓ کے عہد زریں کی تاریخ وتہذیب کی تدوین کا کام سپرد کیا چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اسوہ صحابہ اور مولانا سعید انصاری اور حاجی معین الدین ندوی نے سیر الصحابہ وغیرہ لکھ کر عہد صحابہؓ کی تاریخ کو مرتب کیا۔

۱۹۲۴ء میں سید صاحب نے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولانا سید ریاست علی ندوی کو دارالمصنفین کا رفیق بنایا تو ان دونوں رفقاء کو تاریخ اسلام کے مطالعہ وتحقیق اور تدوین وتالیف کی ذمہ داری سپرد کی مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مشرقی اسلامی ممالک کی تاریخ کا وسعت وگہرائی سے مطالعہ کر کے چار جلدوں میں تاریخ اسلام جیسی بلند پایہ کتاب لکھی اس میں آغاز اسلام سے لے کر بنی عباس کے خاتمہ تک اس عہد کی مکمل اسلامی سیاسی وثقافتی تاریخ آ گئی ہے، اس کتاب نے نصاب تعلیم کی ضرورت کو بھی پورا کیا اور متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل کی گئی اس کے علاوہ شاہ صاحب نے عرب کی موجودہ حکومتیں کے نام سے بھی ایک کتاب مرتب کی جس میں جزیرۃ العرب کی تمام قابل ذکر اسلامی حکومتوں کی تاریخ آ گئی ہے۔

مولانا سید ریاست علی ندوی نے مغربی اسلامی ممالک کے حالات پر تاریخ صقلیہ اور تاریخ اندلس جیسی بلند پایہ تاریخیں مرتب کیں عہد اسلامی کا ہندوستان جیسی مفید کتاب بھی لکھی ڈاکٹر محمد عزیر نے ترک سلاطین کی تاریخ دو جلدوں میں تاریخ دولت عثمانیہ کے نام سے لکھی غرض یہ کہ سید صاحب کی کوششوں سے تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں کی تاریخ وجود میں آئی، تاریخ اسلام کی تدوین کا یہ سلسلہ ابتک جاری ہے اور تقریباً پچاس کتابیں دارالمصنفین سے شائع ہو چکی ہیں۔

ماہنامہ معارف اور تاریخ:

جولائی ۱۹۱۶ء میں سید صاحب نے علامہ شبلی کے تخیل کے مطابق مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ معارف جاری کیا اس کا ایک مقصد جدید اسلوب میں تاریخ اسلام کی ترتیب و تدوین اور اشاعت بھی تھا (۷۵) چنانچہ خود سید صاحب نے تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے بعض علمی، تمدنی اور ثقافتی پہلوؤں پر معارف میں مضامین لکھے اور مستشرقین اور مستغربین کی دروغ بیانیوں کی تردید کا فریضہ بھی انجام دیا۔

سید صاحب تیس برس سے زاید مدت تک معارف کے مدیر رہے اس دوران انہوں نے تاریخ کے پہلوؤں پر ملک کے دوسرے اہل علم کی تحقیقی نگارشات بھی شائع کیں آج معارف کی حیثیت کسی انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں، صرف تاریخ اسلام و مسلمین کے متعلق جو مقالات شائع ہوئے ہیں اگر ان کو کتابی صورت میں یکجا کیا جائے تو خاصہ بڑا ذخیرہ کتب تیار ہو جائے۔ تاریخ اسلام اور اسلامی علوم و فنون کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جو معارف میں پیش نہ کیا گیا ہو اس کا اندازہ معارف کے اشاریہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں ان مقالات و مضامین کی فہرست تقریباً پچاس صفحے میں ہوگی (۷۶)

منصوبہ تدوین تاریخ ہند:

علامہ شبلی نعمانی اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے منصوبہ اغلاط تاریخی کی تصحیح نے مسلمانوں کے اندر ہندوستان کی ایک صحیح اور مستند تاریخ لکھنے کا شدت سے احساس پیدا کر دیا چنانچہ ۱۹۱۷ء میں بعض اخبارات میں اس کی طرف اہل علم کی توجہ مبذول کرائی گئی اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی پر نظر انتخاب پڑی (۷۷) سید صاحب نے بھی اس کی پرزور حمایت کی ابتداءً ان کا خیال تھا کہ یہ تاریخ ہندوستان کی دو عظیم الشان آبادیوں کو ان کی غلط کاریوں پر متنبہ کرنے والی ہوگی۔(۷۸)

مگر اس کے بعد اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی اور یہ تجویز، تجویز ہی رہ گئی ۱۵ برس بعد اگست ۱۹۳۲ء میں سید صاحب نے اپنی ایک تحریر میں ہندو مسلم منافرت کا مبدأ کورٹ کے کارپردازوں اور کالج کے پروفیسروں کو قرار دیا (۷۹) اس کے جواب میں پونہ سے شیخ عبدالقادر نے ایک طویل خط میں سید صاحب کی اس رائے سے اختلاف کیا اور لکھا کہ یہ بات صرف تاریخ ہند کے استاذوں پر کسی قدر عائد کی جاسکتی ہے انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ ان استاذوں کا بھی قصور نہیں کیونکہ نصاب تعلیم وہ تیار نہیں کرتے بازار میں جو کتابیں دستیاب ہوتی ہیں حکومت انہیں نصاب تعلیم میں شامل کر لیتی ہے اس لیے ضرورت ہے کہ تاریخ ہند کی ایسی کتابیں تیار کی جائیں جو ہندو مسلم منافرت نہ پیدا کریں اور یہ بات مؤثر طریقہ سے اٹھائی جائے تاکہ حکومت اس بات کو محسوس کرے، شیخ عبدالقادر نے یہ بھی لکھا کہ الزام و شکایت کے بجائے ضرورت ہے کہ ہندوستان کی صحیح اسلامی تاریخ کی تحقیق وتدوین کے لیے ایک مجلس کی بنیاد ڈالی جائے اور یہ کام منظم طور پر کیا جائے تاکہ یہ مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے۔(۸۰)

چونکہ یہ تجویز خود سید صاحب کے ذہن میں عرصہ سے تھی اور اس کی اہمیت و ضرورت کا انہیں احساس تھا اس لیے انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور لکھا:

> ہمارے فاضل دوست نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ صرف بیماری کا شکوہ نہیں بلکہ بیماری کا علاج کرنا چاہیے ہم بڑی خوشی کے ساتھ ان کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں ...... اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی ایک محقق تاریخ لکھنا آج مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے، دارالمصنفین اس کے لیے اپنے مقدر بھر سب کچھ کرنے کو تیار ہے لیکن ضرورت ہے دوسرے دردمند اہل علم بھی ہمارے کاموں میں حصہ لیں اور اپنی سعی وتحقیق سے ممنون فرمائیں۔
>
> ہمارے نزدیک یہ مناسب ہے کہ تاریخ ہند کے مختلف حصے کر دیے جائیں اور ایک ایک حصہ ایک ایک ایسے شخص کو دیا جائے جس نے اس دور

تاریخی پر کچھ تلاش وجستجو کی ہے اور اگر سرمایہ اجازت دے تو ان کو ان کے کاموں کا مالی معاوضہ بھی دیا جائے (۸۱)۔

اس کے بعد سید صاحب نے تاریخ ہند کی تدوین کا ایک خاکہ تیار کیا جس میں تاریخ ہند کی تدوین کی اہمیت وضرورت اور مقاصد کی بھی وضاحت کی وہ لکھتے ہیں:

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور سلاطین کی بادشاہی اور حکومت اور مسلمانوں نے اس ملک کو جو ترقی دی اور یہاں جو تمدن پیدا کیا ان سب کی ایک مفصل ومکمل اسلامی تاریخ کی ضرورت تاریخی علمی، قومی اور سیاسی ہر حیثیت سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن یہ کام اس قدر اہم ہے کہ اس کو صرف شخصی ہمت سے انجام دینا مشکل ہے، ارباب نظر کی نگاہیں اس کے لیے برابر دارالمصنفین پر پڑرہی ہیں دارالمصنفین نے اب تک اس خدمت کے انجام دینے سے اس لیے پہلو تہی کی کہ اس کے لیے گراں قدر مصارف کی ضرورت ہے جس کے لیے اس کا موجودہ سرمایہ کافی نہیں اس کام کے لیے اس کو جو ضرورت درپیش ہے اس کا مختصر خاکہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ تاریخ ہند کے غیر مطبوعہ نسخوں کی فراہمی اس کی نقل اور ہوسکے تو اس کی خریداری۔

۲۔ تاریخ کی جو مطبوعہ کتابیں ہمارے پاس نہیں ہیں ان کو حاصل کرنا۔

۳۔ یوروپین زبانوں میں قدیم یوروپین سیاحوں نے مغلوں کے عہد کے جو احوال لکھے ہیں یا آج کل انگریزی میں ہندوستان کی جو قابل ذکر تاریخیں لکھی گئی ہیں ان کو خرید کر یا ہدیۃً حاصل کرنا۔

۴۔ مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے اپنے عہد کے جو تاریخی مواد فراہم کئے ہیں ان کو جمع کرنا۔

۵۔ مختلف کتب خانوں میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق جو نادر قلمی

کتابیں موجود ہیں، سفر کر کے ان کا مطالعہ اور ان سے مواد فراہم کرنا۔

۶۔ کتابوں کی ترتیب و تدوین کے لیے چند لائق اشخاص کی خدمت مناسب معاوضہ پر حاصل کرنا۔

۷۔ تیار شدہ کتابوں کو چھاپ کر شائع کرنا (۸۲)

سید صاحب کا خیال تھا کہ تاریخ ہند کی تدوین پندرہ حصوں میں تقسیم کی جائے جن میں عربوں، غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں، مغلوں کے علاوہ دکن، گجرات، مالوہ، خاندیش، کشمیر، ملتان، جون پور، بنگال، حیدرآباد، مرشد آباد، عظیم آباد، اودھ، روہیل کھنڈ، بیدر، ارکاٹ وغیرہ کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ان کی علمی تمدنی اور ثقافتی تاریخ بھی لکھی جائے (۸۳)

سید صاحب کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی جو تاریخیں مختلف زبانوں میں لکھی گئیں وہ درحقیقت مسلمانوں کی تاریخیں نہیں بلکہ وہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخیں ہیں اور ان سے عام مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب اور ان کے علوم وفنون اور تمدن و معاشرت کا پتہ نہیں چلتا اس لیے ضرورت ہے کہ سیاسی تاریخ کے ساتھ عام مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت اور ان کے تمدن کی تاریخ لکھی جائے (۸۴)

تاریخ ہند کی یہ تجویز قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی اہل علم کے ساتھ طلبہ نے بھی اس سے دلچسپی لی، خود سید صاحب لکھتے ہیں:

> ہم نے تاریخ ہند کی نسبت پچھلے دو پرچوں میں جو تجویز پیش کی تھی، بحمداللہ کہ اس نے بڑی ہر دلعزیزی حاصل کی اور اکثر صاحبوں نے اس کی ضرورت کا اعتراف کیا اکثر اردو اور بعض انگریزی اخبارات میں اس کا خیر مقدم کیا گیا خصوصیت کے ساتھ طلبہ کے حلقہ میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا گیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تجویز کتنی ضروری اور اہم ہے۔ (۸۵)

اب اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو ضرورتیں تھیں ایک یہ کہ مورخین

کی ایک مجلس بنائی جائے جو اس کی تدوین میں حصہ لے دوسرے اس کی طباعت واشاعت پر آنے والے اخراجات جمع کئے جائیں، سید صاحب کا تخمینہ تھا کہ اس میں تقریباً سترہ ہزار روپے خرچ ہوں گے اس کے لیے انہوں نے قوم سے اپیل کی چنانچہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے پچاس روپیہ ماہوار ایک سال تک دینے کا وعدہ کیا خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ایک ہزار قسط وار دینے کا وعدہ فرمایا اور خاں بہادر منشی محمد حسین صاحب سابق فائنانس منسٹر رام پور نے پانچ سو روپے یک مشت عطا کئے (۸۶)

تاریخ ہند کی تدوین کے لیے ہندوستان کے مایہ ناز مورخوں کی ایک بزم بنائی اس میں جو مورخ شامل تھے۔ان کے نام یہ ہیں:

(۱) پروفیسر شیخ عبدالقادر دکن کالج پونہ (۲) پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۳) پروفیسر ہارون خاں شروانی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (۴) پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، مؤلف مقدمہ رقعات عالمگیر، اسماعیل کالج بمبئی، (۵) مولانا سید ابوظفر ندوی مؤلف تاریخ گجرات، احمد آباد (۶) ڈاکٹر محمد ناظم مصنف تاریخ محمود، محکمہ آثار قدیمہ دکن، (۷) پروفیسر سید عبدالقادر اسلامیہ کالج، لاہور (۸) حکیم شمس اللہ قادری حیدرآباد (۹) مولوی سید ہاشمی مؤلف تاریخ ہند، (۱۰) مولوی سید مقبول احمد مؤلف حیات جلیل الٰہ آباد (۱۱) مولوی اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی مولف آئینہ حقیقت (۱۲) مولوی سید ریاست علی ندوی مؤلف تاریخ صقلیہ واندلس، دارالمصنفین اعظم گڑھ (۱۳) علامہ عبداللہ یوسف علی (۱۴) ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ لاہور وغیرہ (۸۷)

اس علمی منصوبہ میں حصہ لینے اور اس کو پایہ تکمیل تک پہونچانے کے لیے ڈاکٹر محمد ناظم مصنف تاریخ محمود پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، مؤلف رقعات عالمگیر، پروفیسر محمد ابراہیم عثمانیہ کالج اورنگ آباد اور سید الطاف علی بریلوی مصنف حیات حافظ رحمت خاں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض فضلا نے خود سے اپنی اپنی خدمات پیش کیں جن کا سید صاحب نے خیر مقدم کیا (۸۸)

سید صاحب نے تاریخ ہند کی تجویز کے ضمن میں انگریز مورخوں کے ساتھ بعض ہندو مورخوں کی غلط بیانیوں کی بھی نشاندہی کی تھی اسے بعض ہندو اہل علم نے غلط فہمی کی بنیاد پر پسند نہیں کیا چنانچہ پنڈت منوہر لال زتشی سابق پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ نے سید صاحب کے نام ایک طویل مراسلہ لکھا جس میں طعن و طنز کی زبان میں بعض باتوں سے اپنا اختلاف ظاہر کیا سید صاحب نے ان کا مراسلہ معارف دسمبر ۱۹۳۲ء میں شائع کر کے اس کا جواب لکھا یہ مراسلہ اور اس کا جواب دونوں پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں افادیت کے پیش نظر یہاں دونوں کو نقل کیا تا ہے۔ پنڈت جی لکھتے ہیں:

''جناب عالی! نومبر ۱۹۳۲ء کے معارف کے پرچے میں آپ نے مقالہ بزم تاریخ ہند کے سلسلہ میں ایک نوٹ تحریر فرمایا ہے اس میں آپ نے پہلے پروفیسر رمن کے خلاف ناراضی کا اظہار کیا ہے کہ انہوں نے یورپ کے الزام کی ایک پارینہ کہانی کو حضرت عمرؓ کے خلاف کیوں دہرایا اس کے بعد دی لائف آف اے پرنس کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ جہاں آراء ایک راج پوت پر عاشق تھی گو اس تردید کی تائید میں آپ نے کوئی دلیل سوائے اس کے نہیں پیش کی کہ جہاں آراء صوفی تھی اور حضرت خواجہ چشت خواجہ اجمیری کی معتقد، حسن و عشق کی منزل ملت و مذہب سے بالاتر ہے ممکن ہے کہ دی لائف آف اے پرنس کا یہ بیان غلط ہو اور ممکن ہے کہ صحیح ہو بہر حال جو ہو صوفی ہونے سے نہ اس کی تردید ہوتی ہے نہ تائید اس کے بعد تیسرے پیراگراف میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے ''پونہ کی تاریخ آفریں'' مرہٹہ سوسائٹیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا راز داں ہمارے دوست (شیخ عبدالقادر) سے بڑھ کر پورے ہندوستان میں کوئی نہیں، پونہ، بمبئی، بنگال اور الہ آباد کے مصنف پروفیسروں کی تاریخی تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آج کل الہ آباد کے پروفیسر ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی تاریخ ہند ہمارے صوبے میں پڑھائی جاتی ہے اس کا صرف وہ

باب پڑھنا کافی ہے جس میں عالمگیر اور شیواجی کی داستان لکھی گئی ہے۔''

جہاں تک میں نے اس پیراگراف کو سمجھا ہے اس کا روئے سخن ہندو مصنفین کی طرف ہے اور آپ کی رائے یہ ہے کہ جو ہندو آج کل پونہ، بمبئی، بنگال اور الہ آباد میں تاریخ ہند پر کتابیں لکھ رہے ہیں وہ جان بوجھ کر غلط بیانیاں کر کے مسلمانوں کو قابل اتہام ہتاتے ہیں۔ میں اس کے متعلق چند باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ ان لوگوں کی نیت خراب نہ ہو اور جس اختلاف کی بنا پر آپ ان سے ناراض ہیں وہ واقعی اختلاف رائے ہو کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ آگے چل کر تاریخ ہند کی تصنیف کے واسطے جن بارہ اشخاص کی فہرست آپ نے پیش کی ہے ان میں واقعات تاریخی کے متعلق یا واقعات تاریخی سے گزر کر ان واقعات کے اسباب و نتائج پر رائے زنی کرتے وقت کبھی اختلاف نہیں ہوگا میں مانتا ہوں کہ عالمگیر مسلمان تھا اور شیواجی ہندو مگر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس زمانہ کی تاریخ ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور جناب سید سلیمان ندوی دونوں ٹھنڈے دل سے صداقت اور قابلیت کے ساتھ پڑھیں مگر آخر میں مختلف نتائج پر پہونچیں اور یہ اختلاف بے ایمانی اور بدنیتی سے بری ہو اور ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں کیا یہ بالکل ناممکن ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی رائے صحیح ہو اور جناب سید سلیمان ندوی کی رائے غلط ہو، آپ پروفیسر رمن سے ناراض ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر کے خلاف ایک ایسے اتہام کو دہرایا جس کو آپ غلط سمجھتے ہیں آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ حضرات شیعہ اسی فاتح قیصرو کسریٰ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ دنیائے اسلام بارہ تیرہ سو برس سے سنی شیعہ اختلافات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور اس ہزاروں (۸۹) برس کی لڑائی کی بنا کیا ہے ان واقعات کے متعلق اختلاف جو مدینہ کے شہر میں پچیس تیس برس کے اندر پیش آئے، میں جانتا ہوں کہ آپ سنی ہیں مگر کیا آپ یہ کہنے

کو تیار ہیں کہ جتنے شیعہ مورخین اور مصنفین نے اس زمانے کے واقعات کو آپ
کے خیال اور آپ کی رائے کے خلاف بیان کیا ہے وہ سب بے ایمان تھے اور
انہوں نے ہر موقع پر جان بوجھ کر غلط بیانی کی ہے مولانا شرر لکھنوی مورخ اور
محقق سمجھے جاتے تھے ان کی ایک تصنیف سکینہ بن حسین پر جو شورش بعض اسلامی
حلقوں میں ہوئی تھی اس سے تو آپ واقف ہوں گے، شمس العلماء مولوی نذیر
احمد دہلوی کی ایک تصنیف ہے امہات الامہ اس کے متعلق حیات النذیر مطبوعہ
۱۹۱۲ء کے صفحہ ۴۳۸ پر یہ عبارت درج ہے۔

بہر حال مصنف امہات الامہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ یہ تھا، اب
امہات الامہ کا حشر سنئے کہ اس کی کل جلدیں دہلی کے بعض ممتاز شخصوں کے
کہنے سے ایک تاجر کو دیدی گئیں اور ایک وقت ممتد کے بعد جلا کر خاک سیاہ
کردی گئیں...... شمس العلماء علامہ شبلی فرماتے تھے ...... علامہ موصوف یہ بھی
فرماتے تھے کہ کتاب قابل سوختنی ہے......"

اگر نذیر احمد اور شبلی میں ایسے اہم معاملہ میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے تو
ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور جناب سید سلیمان ندوی میں کیوں نہیں ہوسکتا، ہاں ایک
ہی بات ہے اور وہ یہ کہ اول دونوں حضرات مسلمان تھے اور آخری دونوں
حضرات میں ایک ہندو اور تو اور علامہ شبلی کی مشہور تصنیف الفاروق کی نسبت
شیعہ حضرات کی رائے آپ سے پوشیدہ نہ ہوگی اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ
شعر العجم کی تنقید پنجاب کے بزرگوں کی طرف سے کس بری طرح کی گئی۔ اس
ساری تحریر سے میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جو کوشش ہندؤں کی طرف
سے ہندوستان کی تاریخ لکھنے کی ہو رہی ہے اس کو آپ نے جس طرح یاد کیا ہے
وہ آپ کے شایان شان نہیں اور جس طرح سب مرہٹہ سوسائٹیوں اور پونہ بمبئی،
بنگال اور الہ آباد کے کل پروفیسروں کو آپ نے ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہے وہ

بے تعصبی اور رواداری کے معیار سے فروتر ہے ممکن ہے پونہ کی مرہٹی سوسائٹیوں
میں سے کسی نے کہیں غلطی کی ہو یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مصنف پروفیسر نے کہیں
غلط بیانی کی ہو مگر یہ کہاں نہیں ہوا اور کہاں نہیں ہوتا انسان پھر انسان ہے فرشتہ
یا دیوتا نہیں کیا یورپ کی تواریخ میں ایسے اختلافات نہیں کیا خالص اسلامی تاریخ
ان سے بری ہے اگر ایسا نہیں ہے تو ہندوؤں کے خلاف اس طنز و تشنیع کے کیا
معنی؟ میں جانتا ہوں کہ ہندوؤں کو برا بھلا کہہ کے واہ واہ حاصل کر لینا آسان
ہے مگر میں اب تک معارف کے معیار کو اور جناب سید سلیمان ندوی کی ذات کو
اس سے ارفع سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔

میں ہندو ہوں اور ہندو ہونے پر فخر کرتا ہوں مگر میں نے جو کچھ لکھا ہے
اس میں تعصب یا جانب داری کو دخل نہیں ہندو ہو کر بھی میں نے اپنے خیال اور
اپنے اصول کے مطابق ہندوؤں کے سوشل رسم و رواج اور مذہبی عقائد کی
کمزوریوں کو ظاہر کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ میں ان ہندوؤں میں نہیں جو
اپنے گروہ اور اپنے بزرگوں کے ہر قول و فعل کو صحیح اور درست سمجھتے ہیں اور
کھوٹے کھرے میں تمیز کرنے کو گناہ جانتے ہیں (۹۰)

پنڈت جی کے اعتراضات کا جواب سید صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو وہ لکھتے
ہیں:

ہم نے پنڈت صاحب کے اس خط کو جو اپنے لب ولہجہ اور طعن و طنز کے
لحاظ سے قابل شکایت ہے بجنسہ چھاپ دیا ہے پنڈت صاحب نے اس مراسلہ
میں تین باتیں لکھی ہیں ایک نیک نیتی اور بدنیتی کا سوال دوسرے رائے اور نظریہ
کا اختلاف تیسرے اسباب و نتائج کا اختلاف ہمیں یہ تینوں باتیں تسلیم ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ عرض کرنی ہے کہ تاریخ کی تعلیم و تصنیف کی
دوغرضیں ہیں ایک تو حقائق کا اثبات دوسرے عوام اور طالب علموں کو اپنے

ملک وطن اور اس میں بسنے والی قوموں کے آپس کے تعلقات سے باخبر کرنا
جس سے مستقبل میں قوموں کے درمیان خوش گوار ربط اور تعلقات پیدا
ہوسکیں۔ اسکولوں میں ہندوستان کو جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے اس کا منشا ان
حقائق کا اثبات نہیں جن کی نفی واثبات اور اسباب ونتائج میں بلاتحقیق کے مختلف
خیالات ہیں کہ طرفین کے دلائل کو رد و قدح کے بعد نقل کرنا اور فیصلہ دینا،
اسکول کی مختصر کتابوں میں ممکن نہیں پھر ایسے واقعات کولکھنا جن کے اسباب و
نتائج میں مختلف قوموں کے مختلف خیالات ہیں یا واقعات کو ایسے رنگ میں لکھنا
جو کسی قوم کے نزدیک قابل اعتراض ہے اور پھر ایسی کتابوں میں لکھنا جو ہر قوم
کے بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں کہاں تک قابل پسند ہے۔

اسکولوں میں ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی تاریخ اس غرض سے نہیں پڑھائی جاتی ہے
کہ اس سے ایک مصنف یا مصنف کی قوم کے خیالات اور نظریے معلوم ہوں، اگر یہ کتاب
اس غرض سے ایسے عام اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے تو کیوں نہ اسی کے ساتھ جناب سید
سلیمان صاحب کی بھی کوئی تاریخ پڑھائی جائے اس سے اس منصف یا اس مصنف کی قوم
کے خیالات اور نظریے معلوم ہوں۔ مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں اور فاتحوں کو برا بھلا
کہہ کر واہ واہ حاصل کر لینا آسان ہے مگر میں ابتک ڈاکٹر ایشوری پرشاد اور دوسرے نیک
نیت ہندو مصنفوں اور پبلشروں کی ذات کو اس سے ارفع سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔

اس قسم کی کتابوں کو محض اس بھروسہ پر لکھنا اور اسکولوں کے نصاب میں داخل کرنا
کہ لکھنے والے مصنف پڑھنے والے طالب علم اور چھاپنے والے اصحاب مطابع اور پبلشر
اور کتابوں کے چلنے والے ممبر زیادہ تر ہندو ہیں اور ان کی واہ واہ اسی طرح حاصل ہوسکتی
ہے کچھ زیادہ منصفانہ اور دانش مندانہ کام نہیں۔

اب رہ گیا حقائق کے اثبات کا مسئلہ تو اس کے لیے کالجوں کا میدان کافی ہے
اور ضرورت ہے کہ ہر صاحب نظر اپنی اپنی تحقیق دلائل کے ساتھ پیش کرے لیکن یہ ضرور

ہے کہ اس میں نامستند تحریریں، جعلی دستاویزوں اور مصنوعی واقعات پر بنیادیں کھڑی نہ کی جائیں۔ اس قسم کا کام بعض غرض مند مصنفوں نے شروع کیا اور بعض ہندو مصنف بلا تحقیق اس کی تقلید کررہے ہیں جیسا کہ ٹاڈ نے راجستھان اور ڈف نے تاریخ مرہٹہ میں کیا ہے اور اسی طرح کا وہ طویل خط ہے جس کو کہا جاتا ہے کہ ایک راجہ نے عالمگیر کو بھیجا تھا۔

علیٰ ہذا ان یوروپین سیاحوں کے بیانات ہیں جو اکبر کے زمانے سے ہندوستان میں آنے لگے تھے اور جن میں سے بعض نے شاہی بیگمات کی نسبت نہایت لغو باتیں لکھی ہیں ان باتوں کو مشرقی آداب ورسوم سے ناواقف تو قبول کرسکتا ہے مگر مشرقی طرز و آداب کو جاننے والے بے سند قبول نہیں کرسکتے۔

مس میو نے ہندو یا ہندوستانی معصوم دیویوں کی نسبت چند ماہ کے سفر ہند میں جو کچھ لکھ ڈالا اس کی نسبت صرف یہ کہہ دینا کہ ان کی تردید میں کوئی دلیل نہیں پیش کی گئی ہے فضول بات ہے۔

ظاہر ہے کہ دعویٰ کو سند اور دلیل سے مضبوط کرکے پیش کرنا مدعی کا کام ہے اس کی تردید میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ واقعہ ثابت نہیں ورنہ ہر شریف سے شریف ہندو مسلمان تاریخی خواتین پر کوئی اخلاقی الزام آج مصنف قائم کرسکتا ہے اور جواب میں کہہ سکتا ہے کہ مجیب اس کی مدلل تردید کرے۔

فاتح قیصرہ و کسریٰ کی نسبت بے شبہ حضرات شیعہ دوسری رائے رکھ سکتے ہیں لیکن ہر رائے کی تائید میں واقعات کا موجود ہونا ضروری نہیں چنانچہ الفاروق پر تنقیدیں بہت لکھی گئیں مگر دوسری رائے کے مطابق کوئی الفاروق لکھی نہ جاسکی۔

کتب خانہ اسکندریہ کے الزام کی کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر اب خود یورپ کے محققوں نے اس کی تردید کردی ہے کم از کم آٹھ دس مضمون اس الزام کی تردید میں خود اردو میں نکل چکے ہیں اور پھر اب تک وہی سنی سنائی بات غیر نہیں ہمارے بعض ہندو بھائی دہراتے ہیں تو کیا یہ تعجب انگیز نہیں۔

کسی مصنف کی کتاب میں اتفاقی غلطیوں کا پایا جانا فطرت انسانی ہے، شعرالعجم میں جو مشرقی تذکروں پر مبنی ہے سنین اور نام ونسب کی غلطیاں مغربی تحقیقات کے مطابق دکھائی گئی ہیں ان میں سے بعض صحیح بھی ہیں اور بعض غلط لیکن اگر شعرالعجم کی تنقید پنجاب کے بزرگوں کی طرف سے ''بری طرح'' کی گئی تو اس ''بری طرح'' کو تو کسی نے اچھا نہیں سمجھا۔

مولانا عبدالحلیم شرر صاحب اور مولانا نذیر احمد صاحب نے جو کچھ لکھا اس میں واقعات کا اتنا عیب نہ تھا بلکہ طرز ادا اور طریقہ تعبیر کی افسوس ناک غلطیاں تھیں بات یہ ہے کہ یہ زیادہ تر افسانہ نویس تھے۔ افسانہ نویسی کا منجھا ہوا قلم قابل ادب بزرگوں کے حالات لکھنے میں بھی شوخ نگاری سے باز نہ آیا اس کا نتیجہ مسلمانوں کی عام برہمی کی صورت میں ظاہر ہوا، امہات الامہ کے بعض فقرے مجھ کو ابتک یاد ہیں مثالاً عرض ہے، فاطمہؓ اور عائشہؓ میں جوتیوں میں ڈال بٹتی تھی۔'' اس مفہوم کو اگر یوں ادا کیا جاتا کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ میں باہم ملال خاطر تھا یا ان دونوں کے دل باہم صاف نہ تھے یا ان دونوں کے درمیان اختلاف تھا تو چنداں قابل اعتراض نہ تھا لیکن مولوی صاحب مرحوم کی زبان پر یہ محاورہ ایسا چڑھ گیا تھا کہ ایک دفعہ مجھے ان سے دلی میں ملنے کا اتفاق ہوا تو شاید ایک نشست میں تین چار دفعہ وہ اس محاورہ کو بولے۔

میں نے تمام ہندو مصنفوں اور مورخوں کی نسبت ہرگز یکساں رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ سر جدو ناتھ سرکار سے غلطیاں ہوئی ہیں مگر ان کو بدنیت نہیں کہا گیا ہے اسی طرح ڈاکٹر بنی پرشاد مصنف جہانگیر کی نسبت سب نے اچھے خیال کا اظہار کیا ہے ڈاکٹر تاراچند مصنف مقالہ ''عرب و ہند'' کی سب نے تعریف کی ہے جسٹس راناڈے کے مضامین سب نے پسند کئے ہیں۔

سوئے نیت اور حسن ظن کا اندرونی حال کون جانتا ہے۔ انسان تو ظاہر

ہیں ہے قرائن سے اندر کا حال دریافت کرتا ہے وہ قلم جو قبل از اسلام ہند کی تاریخ میں سراپا امن اور شانتی اور اپنے لیے صرف حسن عمل کا انتخاب کرتا ہے اور دوسرے قسم کے واقعات کو نظر انداز کر جاتا ہے وہی دفعتا اسلام کے عہد میں آکر اس درجہ انصاف پسند ہو جاتا ہے کہ اچھے برے ہر قسم کے واقعہ کے ذکر کئے بغیر اس کی دیانت داری کا احساس مجروح ہوتا ہے۔ اور ہر معاملہ میں اس کو مسلمان حکمرانوں کی صرف برائیاں نظر آتی ہیں اور انہیں کو پھیلانے میں اس کو لطف آتا ہے اور بھلائیوں کو اتنا لپیٹ کر بیان کرے کہ وہ واقعہ کا غیر ضروری پہلو ہو جائے یہ کہاں کا انصاف ہے۔

ابھی پٹنہ یونیوسٹی کی اردو تاریخ کے اقتباسات جریدہ امارت پھلواری میں شائع ہو چکے ہیں۔ اغلاط تاریخی کو چھوڑ کر ایک ہی کتاب کی ایک ہی سطر میں اس درجہ غیریت برتی گئی ہے کہ ہندو راجاؤں کے لیے جمع کا صیغہ تعظیم اور مسلمان بادشاہوں کے لیے تحقیر کا صیغہ واحد شروع سے آخر تک استعمال کیا گیا ہے اس کو رائے اور نظریہ کا اختلاف کہا جائے۔

معارف نے آج جس طرح ڈاکٹر ایشوری پرشاد کی کتاب پر اعتراض کیا ہے کل اس نے اسی طرح مرحوم صلاح الدین خدا بخش اور ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کی تاریخوں پر اعتراضات کئے تھے مگر کیا آج کا کام ہمارے دوست کے نزدیک اس لیے قابل اعتراض ہے کہ وہ مسلمان تھے اور یہ ہندو ہیں۔

پنڈت صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا قلم ہمیشہ ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں بے تعصب رہا ہے اور ہندوں کے علوم و فنون کی مدح میں کمی نہیں کی ہے بایں ہمہ اگر مجھ جیسے مسلمان سے پنڈت منوہر لال زتشی جیسے بے تعصب ہندو کو یہ بے اعتباری اور بدگمانی ہو تو ؎

قیاس کن زگلستان من بہار مرا (۹۰)

اس سلسلہ میں سید صاحب نے ہندؤں کی متعدد بدگمانیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی، اور اپنا مقصد اصلاح بتایا اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ:

ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ ہم ہندوستان کی ایسی تاریخ لکھیں جس میں یہاں کے مسلمان بادشاہوں کو معصوم و بے گناہ ثابت کریں بلکہ یہ مقصد ہے کہ ایسی تاریخ لکھیں اور ایسے طرز میں لکھیں جس سے ہندو مسلمانوں میں منافرت پیدا ہونے کے بجائے یک جہتی اور اتحاد پیدا ہو تاریخ کچا مواد ہے اس سے بنانے والا جو چاہے بنا سکتا ہے چنانچہ انگریزوں کے بعد جب سے ہندو مورخوں نے کتابیں لکھنی شروع کی ہیں انہوں نے ہندو دور کو جس آب و رنگ سے لکھنا شروع کیا ہے اس کو پڑھ کر ہر ہندو طالب علم کے دل میں اپنے بزرگوں کی اچھی تقلید کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ساتھ ہی چھوت چھات اور بدھ، جینی، ویدک اور آریہ دھرم کے درمیان اتحاد کا خیال بڑھتا ہے اور اس میں متحدہ ہندو قومی اسپرٹ پیدا کی جاتی ہے کیا اتنی اصلاحوں کے بعد ہمارے ہندو مورخ اتنی اصلاح نہیں کر سکتے کہ واقعات کو اس رنگ میں لکھیں جس سے ہندو مسلم خلیج کا پاٹ بڑھنے کے بجائے گھٹتا جائے۔

مثال کے طور پر ہم یہاں ایک واقعہ لکھتے ہیں، ڈاکٹر ایشوری پرشاد محمود غزنوی کے حملہ ہند کے سلسلہ میں جہاد کا لفظ بول کر اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

اہل اسلام کا خیال تھا کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ کافروں یعنی اسلام نہ ماننے والوں سے لڑائی کر کے یا تو ان کو دائرہ اسلام میں شامل کرے یا تلوار کے گھاٹ اتار دے اس لڑائی کو جہاد کہتے ہیں (اسٹوڈنٹس ہسٹری ص ۱۲۸)

ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق بجائے خود کہاں تک درست ہے اس کو الگ رکھئے جس وقت یہ کتاب اسکول کے کسی درجہ میں پڑھائی جاتی ہوگی دونوں فرقوں کے لڑکوں کے جذبات پر اس تشریح کا کیا اثر پڑتا ہوگا اور مسلمان لڑکے یا

تو شرم سے عرق عرق ہو جاتے ہوں گے یا غصہ میں آ کر کتاب اور مدرس کتاب سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہوں گے کیا ہم اپنے ہندو مصنفوں کو اس طریقہ تالیف کی اصلاح کا مشورہ دیتے ہیں تو ان کے ساتھ بدگمانی کرتے ہیں (۹۱)

اس طویل لیکن نہایت مفید بحث کو یہاں پیش کرنے کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ سید صاحب نے تاریخ ہند کی تدوین کا کام کن اسباب و اغراض کے تحت دارالمصنفین میں شروع کرایا، انہوں نے احمد آباد سے مولانا سید ابوظفر ندوی کو بلا کر اس کام کا آغاز کرایا جنہوں نے کئی برس تک تاریخ ہند کا محنت سے مطالعہ کیا اور مختصر تاریخ ہند، تاریخ سندھ (دو حصوں میں) اور تاریخ خاندان غزنہ جیسی محققانہ اور گراں مایہ کتابیں لکھیں، ہندوستان کی تمدنی تاریخ کی تدوین مولانا عبدالسلام ندوی نے شروع کی لیکن وہ اس کو مکمل نہ کر سکے اسی زمانہ میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن دارالمصنفین کے رفیق بنائے گئے سید صاحب نے انہیں بھی تاریخ کی تدوین کی ذمہ داری سپرد کی صباح الدین صاحبؒ نے اس سلسلے میں ''ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام'' نہایت تلاش و تفحص سے لکھی، وہ آخر وقت تک اس کام میں مصروف رہے اور ان کے قلم سے بزم تیموریہ، بزم مملوکیہ، بزم صوفیہ، مذہبی رواداری اور ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، تمدنی کارنامے جیسی اہم تاریخی کتابیں وجود میں آئیں۔ ابتک ان کی دو درجن سے زیادہ کتابیں اسی تاریخ ہند کے تعلق سے شائع ہو چکی ہیں۔

حیات سلیمان کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ مخفی نہیں کہ سید صاحب آخر وقت تک اس کام کے لیے فکرمند رہے معارف میں بار بار اس کا ذکر کیا اور لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا، گو یہ افسوسناک پہلو بھی ہے کہ اہل علم اور ارباب ثروت نے ابتدائی سرگرمیوں کے بعد پھر توجہ نہ دی اور یہ کام حسب منشاء و منصوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہونچ سکا، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

گو اس تجویز کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا لیکن یہ کام

اجتماعی اشتراک و تعاون سے آگے نہ بڑھ سکا، دارالمصنفین کے ذرائع نے
جہاں تک اجازت دی اس کام کو جاری رکھا بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر مجوزہ
خاکہ کے مطابق تو نہ انجام پاسکا لیکن دارالمصنفین نے تاریخ ہند کے مختلف
پہلوؤں پر دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع کیں جس کا سلسلہ ابتک جاری
ہے۔(۹۲)

یہ منصوبہ تاریخ ہند اگر حسب منشا پایہ تکمیل کو پہونچ گیا ہوتا اور اس کی عام نشر و اشاعت ہوئی ہوتی تو مسلمان ایک بڑا علمی، ملی اور قومی کام کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے اور غالباً ملک کی موجودہ فضا بھی اس قدر تلخ، مکدر اور ان کے خلاف نہ ہوتی اور ہندو مسلم اختلاف و انتشار کے بجائے اتحاد و یک جہتی کی فضا قائم ہوئی ہوتی اور جو الزامات انگریز مورخوں نے لگائے تھے ان کو دہرانے والا کوئی نہ ہوتا۔

تاریخی تصنیفات:

سید صاحب نے تاریخ کی مذکورہ خدمات کے علاوہ متعدد تاریخی کتابیں لکھیں اور تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر داد تحقیق دی یہاں ان کی تاریخی تصانیف کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

ارض القرآن:

یہ سید صاحب کی پہلی تصنیف ہے وہ جب دفتر سیرت نبویؐ میں علامہ شبلی کے معاون تھے تو اس کتاب کا مواد سیرۃ النبی کے لیے جمع کیا تھا۔ اسی کو ارض القرآن کی شکل میں پیش کیا۔ سید صاحب نے بجا طور پر اسے سیرۃ النبی کا مقدمہ قرار دیا ہے۔(۹۳)

جغرافیائی تاریخ کی اردو زبان میں یہ پہلی مستقل تصنیف ہے خود سید صاحب نے لکھا ہے کہ ''اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا۔ قرآن

مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں اور نہایت عجیب بات یہ ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی (۹۴)

اس کتاب کی تالیف کا مقصد اور اس کی غرض و غایت عرب کی قدیم تاریخ و جغرافیہ کی تحقیق اور قرآن مجید کے تاریخی اور جغرافیائی بیانات کے سلسلہ میں مستشرقین کے اعتراضات کی تردید و تصحیح ہے۔

قرآن پاک میں عبرت و نصیحت کے لیے قدیم عرب کی اقوام اور ان کے انبیاء و رسل اور ان کے اماکن و آبادیوں کا ذکر کیا گیا ہے یورپ کے مورخین نے قدیم آثار وکتبات اور جدید اثری انکشافات وتحقیقات کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا ہے مگر نتائج کے استنباط میں بڑی بددیانتی سے کام لیا ہے اور قرآن پاک کے بیانات کو مشتبہ اور غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کی ان غلط کاریوں کی مختلف وجوہات ہیں چونکہ قدیم عرب کا ماخذ عربوں کی زبانی روایات اور اسرائیلیات ہیں جن میں بہت سی بے سروپا روایتیں عام ہیں اور انہیں روایات کو بعد کے مفسرین نے پس منظر کے طور پر اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے جس سے یورپ کے مورخین کو کھل کھیلنے کا موقع ہاتھ آ گیا لیکن اس غلط بیانی کا سب سے بڑا سبب ان کا وہ قدیم مذہبی و آبائی تعصب ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے تئیں روا رکھا گیا ہے۔

سید صاحب نے ارض القرآن میں مورخین یورپ اور مستشرقین کی تحقیقات اور غلط بیانیوں کا جائزہ لیا ہے اور تحقیق وتدقیق سے قرآن پاک کے بیانات کی صداقت ثابت کی ہے جو مستشرقین کی تحقیقات کے مطابق بھی ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے یورپ کی بددیانتیوں کی نشاندہی بھی کردی ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ کی ابتداء میں ۸۲ صفحات کا یک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں قدیم عرب کے تاریخ وجغرافیہ کے قدیم وجدید ماخذ یعنی قرآن

مجید، تفسیری روایات، اسرائیلیات، انساب، کلام عرب اور اس موضوع سے متعلق اسلامی، رومی اور یونانی مصنفین کی کتابوں اور عرب کی قدیم روایتوں اور جدید اثری اکتشافات پر بحث و تحقیق کی گئی ہے۔

اس کے بعد قدیم عرب کا مفصل جغرافیہ اور اس کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے نیز قرآن پاک میں جن اقوام و قبائل مثلاً مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنواسماعیل، اصحاب ارس، اصحاب الحجر، انصار اور قریش وغیرہ اور مقامات اور آبادیوں کا ذکر ہے اور جدید اثری تحقیقات کی روشنی میں ان کی صحیح تاریخ لکھی گئی ہے۔

دوسرے حصہ میں قرآن پاک، توراۃ، رومی ویونانی مصنفین اور محققین کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات کی روشنی میں بنوابراہیم کی تاریخ اور عربوں کی قبل از اسلام کی تجارت اور ان کے مذاہب کا مفصل حال لکھا گیا ہے نیز قرآن پاک کے بیانات کی جدید مآخذوں سے تائید و توثیق اور مستشرقین کے غلط بیانات کی تردید کی گئی ہے جس سے قدیم عرب کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے اور قرآن پاک کی صداقت اور اس کی تاریخی حیثیت بھی پوری طرح واضح ہوجاتی ہے، نقش اول ہونے کے باوجود اپنے موضوع کی سب سے اہم کتاب ہے تاہم اب تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد جدید تحقیقات کی روشنی میں اب اس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات :

مولانا سید سلیمان ندوی کی تاریخی تصنیفات میں عرب و ہند کے تعلقات ایکمعرکۃ الآراء اور نہایت محققانہ تالیف ہے یہ دراصل ان خطباب کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۲۲ر ۲۳ر مارچ ۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکادمی الہٰ آباد کی فرمائش پر الہ آباد میں دیے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں اکادمی نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا اور انعام سے بھی نوازا۔
یہ کتاب چونکہ ایک منفرد موضوع پر پہلی تحریر تھی اس لیے بے حد مقبول ہوئی۔

جناب سعید الحق دسنوی نے اسے انگریزی قالب میں ڈھالا جو پہلے اسلامک کلچر حیدر آباد میں ۳۳-۱۹۳۲ء میں بالاقساط شائع ہوا بعد ازاں حکومت پاکستان نے کتابی صورت میں شائع کیا ایک اور انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد صلاح الدین جامعہ عثمانیہ کے قلم سے ہے جسے انسٹی ٹیوٹ آف انڈو میڈلسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدر آباد نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔

ابتدائی تعلقات کی تاریخ:

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب کے شروع میں عربوں کی ہندوستان سے محبت و شیفتگی اور ابتدائی ہند و عرب کے تعلقات کی تاریخ ہے اور بقول سید صاحب ''اہل عرب کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستان سے ان کا تعلق صرف چند ہزار برس کا نہیں بلکہ پیدائش کے شروع سے یہ ملک ان کا پدری وطن ہے''(۹۵)

اس کے بعد سید صاحب نے متعدد روایات و واقعات کے ذریعہ عربوں کی ہندوستان سے ابتدائی واقفیت اور موانست کا ذکر کیا ہے پھر لفظ ہند پر بحث کی گئی ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ہندوستان کا نام ہند کیسے پڑا، پھر سید صاحب نے تاریخی شواہد سے بتایا ہے کہ دنیا کی پہلی بحری تجارتی قوم فنیشین عرب تھے جو شام کے سواحل پر آباد ہو گئے تھے جن کے اثرات ظہور اسلام سے صدیوں پہلے ہندوستان پر پڑ چکے تھے۔

عرب و ہند کے تعلقات کی قدامت واضح کرنے کے لیے سید صاحب نے سیتارتھ پرکاش (پہلا پرو ادھیائے ۱۴۷) کے مصنف سوامی دیانند سے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ''مہابھارت میں جب کوروں نے راکھ کا گھر بنا کر پانڈوں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو ودر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا (۹۶) اس واقعہ کے بارے میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ گو اس کا یقین مشکل سے آسکتا ہے تاہم ایک بڑے پنڈت نے اس کو تسلیم کیا ہے اس لیے اس کے انکار کی مجھ میں جرأت نہیں (۹۷)

اسی باب میں سید صاحب نے ہندوستان پر مسلمانوں کی فتح سندھ کی اجمالی تاریخ بھی لکھی ہے اور قدیم مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کی کتابوں سے قدیم ہندوستان کے حالات قلم بند کئے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ انہوں نے اس دور میں ہندوستان کی بڑی تاریخی خدمت انجام دی بعد ازاں ان مورخوں اور جغرافیہ نویسوں کے حالات و سوانح بھی لکھے ہیں جو اگر چہ ہندوستان نہیں آئے مگر اپنی کتابوں میں یہاں کے حالات لکھے ہیں۔

تجارتی تعلقات کی تاریخ:

دوسرے باب میں تجارتی تعلقات کی قدامت پر روشنی ڈالی گئی ہے عرب تاجروں کی اہمیت کے ساتھ تجارتی راستوں، منزلوں اور بندرگاہوں کی بھی تفصیل ہے بعد ازاں دوسری اقوام تجارت اور ہندوستان کی پیداوار، مصنوعات اور سامان تجارت، تجارتی درآمد و برآمد -- عرب کے ہندوستانی تاجروں، بحر ہند میں چلنے والے جہازوں کی وسعت، ہندوستان کی بحری تجارت اور یہاں کی دولت و ثروت کا مفصل ذکر ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بحر روم کو چھوڑ کر افریقہ کے پشت سے بحر ہند میں داخل ہونے کے راستہ کی تلاش کا سہرا واسکوڈی گاما کے سر باندھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس راستہ کی تلاش سب سے پہلے عربوں نے کی اور واسکوڈی گاماں کو ہندوستان پہونچانے والا بھی ایک عرب تاجر ابن ماجد تھا جس کا لقب اسد البحرین یعنی سمندروں کا شیر تھا (۹۸)

علمی تعلقات کی تاریخ:

تیسرے باب میں عربوں کے ہندوستان سے علمی روابط کا تذکرہ ہے اور دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان سے علمی روابط کا آغاز اگر چہ بنوامیہ کے دور سے شروع ہوا مگر اصل علمی تعلقات کا آغاز عہد عباسی میں خاندان برامکہ کے ذریعہ ہوا۔ برامکہ کی

کوششوں سے ہند وفضلاء بغداد پہونچے اور انہوں نے ہندوستان کے مختلف علوم وفنون کا عربی زبان میں ترجمہ کیا برامکہ کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ ایرانی مجوسی تھے مگر سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ ''برامکہ بدھ مذہب کے پیرو تھے اوران کا اصل تعلق ہندوستان سے تھا نہ کہ ایران سے۔(۹۹)

برامکہ کے زوال کے بعد مامون کے عہد میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ سید صاحب نے اس باب میں طب، نجوم، جوتش، ہیئت، ریاضی، موسیقی، جنگ وسیاست، منطق وکیمیا، جفرورمل، قصص و حکایات اور اخلاق وحکمت کی جو کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں اور جن ہندوفضلاء نے بغداد میں یہ خدمت انجام دیں ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے باب کے آخر میں البیرونی کے حالات ہیں، البیرونی نے ہندوستان کی وہ خدمت انجام دی جو اس عہد کے کسی ہندو فاضل سے بھی نہ ہوسکی، سید صاحب رقمطراز ہیں:

> بیرونی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان علمی سفارت کا کام انجام دیا اس نے عربوں اور ایرانیوں کو ہندؤں کے علوم سے اور ہندؤں کو عربوں اور ایرانیوں کی تحقیقات سے آگاہ کیا۔ اس نے عربی جاننے والوں کے لیے عربی سے کتابیں ترجمہ کیں اور اس طرح وہ قرض ادا کیا جو ہندوستان کا مدت سے عربی زبان کے علوم وفنون پر چلا آرہا تھا۔(۱۰۰)

مذہبی تعلقات کی تاریخ:

چوتھے باب میں مذہبی تعلقات کی تاریخ ہے سید صاحب نے پہلے ان خیالات کی تردید کی ہے جو عام طور سے انگریز مورخوں نے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے بارے میں مشہور کر رکھے تھے۔ سید صاحب نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمراں اگرچہ مسلمان تھے مگر وہ مجموعی طور سے اسلام کے نمائندہ نہ تھے اور نہ ان کی حکومت اسلامی حکومت تھی یہاں تک کہ ان کے افسر اسلام کے صلح و جنگ اور حاکم ومحکوم کے قوانین سے

بھی ناواقف تھے۔(۱۰۱) اس لیے ان کے اعمال وافعال کو مذہب سے جوڑنا اور اس سے اسلام پر تنقید کرنا کسی حیثیت سے صحیح نہیں ہے، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اسلام کے اصل نمائندے عرب تھے ان کا نظام حکومت اسلامی نظام حکومت تھا اور ان کے عہد حکمرانی میں ظلم وزیادتی کی مثالیں شاذ ونادر ہی ملیں گی ان کے اندر بڑی مذہبی رواداری اور فراخدلی تھی۔ انہوں نے اپنے محکوم قوموں کے مذہبی رسم ورواج میں کوئی مداخلت نہیں کی اور نہ ان کی عبادت گاہوں پر کہیں ہاتھ اٹھایا اور جزیہ کے بعد ان کو مسلمان کے برابر درجہ دیا۔ سندھ کی حکومت اسی روش پر قائم رہی اور ہندوؤں کو اہل کتاب کے مشابہ قرار دے کر ان کی عورتوں اور ذبیحہ کے سوا ہر چیز میں انہیں اہل کتاب کے برابر حقوق دیئے، اسی ضمن میں سید صاحب نے کافر ومسلم، اہل کتاب اور جزیہ جیسے اہم مسائل ومباحث زیر بحث لا کر ان امور کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کی ہیں۔

ان مباحث کے بعد دکھایا گیا ہے کہ عربوں کے ہندوستان سے گوناگوں مذہبی تعلقات ہی کی وجہ سے عرب سیاح ومورخین کو یہاں کے مذاہب کی تحقیقات کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے نہایت تلاش وتفحص اور تحقیق وتدقیق کے ساتھ یہاں کہ مذاہب کا حال لکھا جس میں ہندو مذاہب، ان کے فرقے، عقائد، مذہبی رسم ورواج، علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور ثقافت کی مختلف النوع تفصیلات لکھیں۔ سید صاحب نے زیادہ تر انہیں کے بیانات کی روشنی میں علمی ومذہبی تعلقات کی مرقع کشی کی ہے۔

فرقہ سمنیہ کا ذکر عربی تاریخ وتذکرہ میں موجود ہے اس پر سید صاحب نے بڑی محققانہ بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ فرقہ سمنیہ دراصل بدھ تھے اور ہندوستان میں ابتدائی اسلامی فتوحات کے زمانہ میں جن علاقوں سے مسلمانوں کا خاص تعلق رہا وہاں زیادہ تر بدھ ہی آباد تھے۔

اس باب میں سید صاحب نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک دوسرے پر اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے چنانچہ انہوں نے مذہبی تعلقات کے ضمن میں دکھایا ہے کہ

اسلام کا اثر رفتہ رفتہ ہندوستان پر پڑا بعض ہندو راجہ مسلمان ہوئے اور ان کے درمیان مذہبی روابط اس قدر بڑھے کہ سندھ کے ایک راجہ نے قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کرایا، ہندوستان میں توحید خالص کا تصور بھی سید صاحب کے نزدیک اسلام کے اثرات ہی کا نتیجہ ہے۔ سید صاحب نے اسی بحث میں مسلمانوں کے ان اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے جو انہوں نے ہندوؤں سے قبول کئے۔

فتوحات اسلامی سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادیاں:

پانچویں اور آخری باب میں سید صاحب نے ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے قبل کی مسلمانوں کی آبادیوں کی تفصیل لکھی ہے یہ باب اصلاً گذشتہ ابواب کے مباحث کا ماحصل ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ دکن اور جنوبی ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی حکومتیں سب سے آخر میں قائم ہوئیں وہیں مسلمان پہلے سے آباد تھے اور وہاں کا کوئی ساحلی اور تجارتی شہر مسلمانوں سے خالی نہ تھا یہاں تک کہ بعض بعض شہروں میں ان کی آبادیاں کئی کئی ہزار تھیں اور وہاں کے ہندو راجاؤں پر ان کا بڑا اخلاقی اثر تھا اور وہ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے اور ان کو ہر طرح کی سہولتیں بھی فراہم کرتے تھے۔ مسلمانوں کی آبادیاں مسجدوں سے معمور تھیں یہی نہیں بلکہ جہاں زیادہ آبادیاں تھیں وہاں ان کا مذہبی نظام اس طرح قائم تھا کہ وہ اپنے باہمی معاملات ومسائل کا فیصلہ اسلامی قوانین کے ذریعہ کرتے تھے اور اس کے لیے باقاعدہ ائمہ وقضاۃ مقرر تھے۔

سید صاحب نے مسلمانوں کی آمد کی تاریخ اور ان کی اہم آبادیوں کے مفصل حالات بھی لکھے ہیں جن سے ان کا نظام معاشرت اور ہندوؤں سے ان کے تعلقات کی تمام تفصیلات بھی سامنے آجاتی ہیں۔ باب کے آخر میں سندھ وملتان کے مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملہ سے پہلے بھی یہاں کئی سو مسلمان آباد تھے۔

دولت عباسیہ کے ابتدائی ادوار تک سندھ میں مسلمانوں کی تاریخ بہت واضح انداز میں ملتی ہے مگر اس کے بعد وہاں کی طوائف الملوکی کے زمانہ کی تاریخ غیر واضح ہے۔ غزنویوں اور غوریوں سے پہلے یہاں کئی دوسرے مسلمان خانوادوں نے حکمرانی کی بلکہ ایک ایک وقت میں دو دو حکومتیں قائم رہیں۔ سید صاحب نے ان خانوادوں کے معلوم حالات کے علاوہ سندھ کے بعض اہم شہروں کے مختلف قسم کے حالات بھی لکھے ہیں اور بعض قدیم شہروں کے جائے وقوع کی تعیین بھی کی ہے جن کے نام اب صرف تاریخوں میں ملتے ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں جدید تحقیقات پیش کی گئی ہیں، ایک مسلم آبادی سوپارہ، جاٹ طبیب اور سندھ کے شاہانہ جوتوں کا تذکرہ ہے۔

یہ پوری کتاب انگریزوں کے اس الزام کی کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق محض فاتحانہ اور حملہ آورانہ تھا تردید ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب سے یہ بخوبی ثابت ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کے حملہ سے بہت پہلے ہندوستان سے ان کے علمی، تجارتی اور مذہبی وغیرہ متنوع تعلقات وروابط تھے۔

یہ کتاب سید صاحب کی بیس سال کی تحقیق وتدقیق کا نتیجہ ہے اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ جب یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہیں تھی آج اس موضوع پر بڑا لٹریچر تیار ہوگیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب بھی اس کی انفرادیت قائم ہے۔ سید صاحب نے ۱۹۲۹ء میں جو کچھ لکھا تھا اس کی تائید حال میں دریافت ہوئے Giniza Recard سے بھی ہوتی ہے۔ (۱۰۲)

عربوں کی جہاز رانی:

سید صاحب کی تیسری مایہ ناز تاریخی تصنیف عربوں کی جہاز رانی ہے یہ بھی ان کے خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے بمبئی کے محکمہ تعلیم کی فرمائش پر انجمن اسلام بمبئی میں ۱۸-۲۱ مارچ ۱۹۳۰ء میں دیے تھے اسے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی نے ۱۹۳۵ء

میں کتابی صورت میں شائع کیا۔

اس میں عربوں کی جہازرانی کی ابتداء و ارتقا، ان کی بحری ایجادات و اختراعات، بحری تصنیفات اور اس میدان میں عربوں کے عروج و زوال کی تاریخ نہایت تلاش و تفحص اور تحقیق و تدقیق سے قلم بند کی گئی ہے۔

یہ کتاب موضوع کی انفرادیت اور بلند پایہ تحقیق و دیدہ ریزی کا بہترین نمونہ ہونے کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے لکھا ہے کہ'' یہ ان خوش نصیب کتابوں میں سے ایک ہے جسے متخصصین اور عوام دونوں نے پسند کیا(۱۰۳) کتاب کی ابتداء، ایک مختصری تمہید سے ہوئی ہے جس میں موضوع کی اہمیت اور جہازرانی سے عربوں کی دلچسپی کے اسباب لکھے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ'' عرب چونکہ تین طرف سے دریاؤں سے گھرا ہے چند ساحلی صوبوں کو چھوڑ کر عرب ایک خشک بے آب و گیاہ اور بنجر ملک ہے اس لیے وہاں کے باشندے فطری طور پر تجارت پیشہ بننے پر مجبور ہوئے'' (۱۰۴) اور تجارتی اسفار نے انہیں بحری معلومات اور ایجادات و اختراعات سے ہم کنار کیا اور وہ دنیا کے بہترین جہازراں اور دریا پیماں قوم ہوئے، سید صاحب عربوں کی بحری سرگرمیوں کی قدامت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایسے شواہد موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کو اس فن میں اسلام سے پہلے بھی درک تھا۔ اسلام نے آکر جہاں ان کے ہر قسم کے قویٰ کو نشو ونما اور ترقی بخشی وہیں ان کی بحری جرأت و ہمت کو بھی بڑھایا اور اپنے پرچم کے زیر سایہ ان کو دنیا کے تمام گوشوں میں پہونچا دیا۔'' (۱۰۵)

اس کے بعد سید صاحب نے عہد جاہلیت میں عربوں کی بحری دلچسپیوں کا سراغ لگایا ہے اس سلسلہ میں انہوں نے لغات عرب، اشعار جاہلیت اور قرآن مجید سے دلائل و شواہد فراہم کئے ہیں،لغات عرب سے دریا،سمندر، کشتی،جہازراں، جہازرانی اور بندرگاہوں سے متعلق سیکڑوں الفاظ نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ'' اگر ان الفاظ پر غور کیا

جائے تو عربوں کی جہازرانی، اس کی ترقی، اس کی وسعت اور اس کے ذریعہ مختلف قوموں سے ان کے میل جول اور اختلاط کی پوری تاریخ مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے"۔ اور" یہ الفاظ پتہ دیتے ہیں کہ عربوں کو اسلام کے پہلے بھی جہازرانی سے شغف تھا۔"(۱۰۶)

اس کے بعد جاہلی شعراء کے کلام سے استدلال کیا ہے اور لکھا ہے کہ عربوں کی اسلام سے پہلے کی تاریخ کا واحد اور تنہا ذریعہ ان کے اشعار ہیں (۱۰۷) اس لیے انہوں نے جاہلی شعرا کے کلام میں بحری تلمیحات، تمثیلات اور استعارات کی مثالیں پیش کر کے ان سے عربوں کی بحری واقفیت پر استدلال کیا ہے، آخر میں قرآن مجید کی آیات سے استدلال کیا گیا ہے جو قبل از اسلام عربوں کی تاریخ کا سب سے زیادہ معیاری ماخذ ہے، سید صاحب نے لکھا ہے کہ بحریات سے متعلق قرآن مجید میں اس قدر تفصیلات ہیں جن کا سمیٹنا مشکل ہے پھر انہوں نے قرآن مجید کی ۲۸ آیات پیش کر کے ان سے ثابت کیا ہے کہ عرب قبل از اسلام جہازرانی سے بہ خوبی واقف تھے۔

اس کے بعد عہد رسالت، خلفائے راشدین، بنوامیہ، بنوعباس، فاطمین مصر اور اندلسی بنوامیہ کے ادوار میں جو بحری ترقیاں ہوئیں اور عرب جہازراں جس اوج کمال پر پہونچے اس کی تاریخ ہے سید صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اس فن پر باقاعدہ توجہ دی گئی ۳۱ھ میں جب قیصر روم نے چھ سو جہازوں کے ساتھ سواحل شام پر حملہ کیا تو مسلمانوں نے اپنے بحری بیڑے کی مدد سے اس کو پسپا کر دیا۔(۱۰۸)

بنوامیہ کے دور میں اس فن نے مزید ترقی کی اس عہد میں جہازرانی کا از سر نو جائزہ لیا گیا اور اسے ترقی دینے کی بھرپور کوشش کی گئی بحری بیڑوں ہی کی مدد سے بحر روم کے جزیرے سسلی (صقلیہ) اور اسپین وغیرہ کو فتح کیا گیا اسی دور میں تجارتی جہاز لوٹنے کی پاداش میں سندھ پر مسلمان حملہ آور ہوئے اور اسے فتح کیا اس طرح کی بعض اور دوسری بحری جنگوں کی تفصیلات بھی سید صاحب نے لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ عہد بنوامیہ میں عربوں کی جہازرانی عروج پر تھی۔

اس کے بعد بعض دوسرے عہد کی بحری سرگرمیوں کا ذکر ہے ان مباحث میں ضمناً عربوں کی بحری معلومات واختراعات کو بھی بیان کیا گیا ہے مثلاً ان کی دریاؤں، سمندروں اور ان کے راستوں سے واقفیت، سمندروں کی پیمائش، نشان میل اور متعدد بندرگاہوں کا بھی ذکر ہے ان میں بصرہ، سیراف، عدن، صمار، شجر، قیس، بحرین، ہرمز، جدہ، جاجد، ابلہ، غلافقہ اور عیذاب وغیرہ کا ذکر بھی ہے بعض دوسرے ملکوں کی بندرگاہوں کا بھی ذکر ہے جن تک عربوں کی رسائی تھی اور جہاں عربوں کے تجارتی بیڑے آمدورفت رکھتے تھے اس میں ہندوستان، افریقہ، روم، سسلی اور اندلس کے بندرگاہ اشبیلہ، دانیہ، اور دہران وغیرہ کا بھی بیان ہے غرض عربوں کی جہازرانی کی ابتداء سے لے کر دسویں صدی ہجری تک عربوں کی جہازرانی کی پوری تاریخ عہد بہ عہد ارتقا اور ان کی خصوصیات وامتیازات کو مستند مآخذ سے قلم بند کیا گیا ہے۔

ایک باب میں جہازرانی کے آلات اور ساز وسامان کی تفصیلات ہیں ان میں جہاز کے ساتھ بحری نقشوں، لائٹ ہاؤس، صدرکواکب، قطب نما اور بعض دوسرے فلکی آلات کی ایجادات وترقی ان کی شکل وہیئت اور ان کے طریقہ استعمال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاز، جہاز سازوں اور متعدد جہازرانوں کا تعارف اور ان کے مختصر حالات بھی لکھے گئے ہیں اسی باب میں عربوں کی جہاز رانی کے تنزل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ جب دوسری قوموں نے اس فن سے دلچسپی لی اور ترقی کی تو اپنے اپنے علاقوں پر انہوں نے اپنا اثر ورسوخ قائم کرلیا اور عربوں کی جہازرانی کا آہستہ آہستہ خاتمہ ہوگیا۔

آخری باب عربوں کی بحری تصنیفات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں یہ فن سینہ بہ سینہ موروثی تھا۔ نویں صدی ہجری سے پہلے اس فن میں کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا سید صاحب نے اس فن کی ابتدائی تحریریں ان نقشہ جات کو قرار دیا ہے جو عرب جہازرانوں نے ستاروں کی شناخت ہواؤں کی دریافت، ساحلی ممالک اور جزیروں سے

واقفیت اور سواحل کے طول وعرض وبلد اور سمندروں کی پیائش کے متعلق تیار کیے تھے،نویں صدی ہجری میں اس فن کو مدون کرنے کی کوشش کی گئی اسدالبحرین ابن ماجد پہلا شخص تھا جس نے اس فن سے متعلق نظم ونثر میں تقریبا پچیس کتابیں تصنیف کیں سید صاحب نے اس کی ١٦ کتابوں کا تعارف کرایا ہے ایک دوسرے مصنف سلیمان مہری کی چار کتابوں کا بھی تعارف ہے ان تعارفی مباحث سے عربوں کی بحری ترقی کی تاریخ کے بعض پہلو سامنے آجاتے ہیں اس سلسلہ کی بعض دوسری کتابوں کا بھی ذکر ہے۔

عرب وامریکہ:

کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں جو ١٩٥٨ء میں شائع ہوا دوضمیموں کا اضافہ کیا گیا ہے پہلا ضمیمہ سید صاحب کا ایک مضمون عرب وامریکہ ہے یہ دراصل اسی کتاب کا حصہ تھا جو طباعت کے وقت بعض تحقیقات کے تشنہ رہ جانے کی وجہ سے شائع نہ ہوسکا تھا اس میں امریکہ کی دریافت اور عربوں سے اس کے روابط پر بحث کی گئی ہے۔ عام طور سے مشہور ہے کہ امریکہ کو ١٣٩٨ء میں کولمبس نے دریافت کرکے پرانی دنیا کونئی دنیا سے متعارف کرایا مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا پر پرانی دنیا کے کسی شخص کے قدم نہیں پہونچے تھے۔ سید صاحب نے قدیم وجدید تحقیقات اور بعض سیاحوں کے بیانات اور جدید مورخین کے آراء وخیالات کی روشنی میں ثابت کیا کہ کولمبس سے پہلے افریقی عرب وہاں پہونچ چکے تھے اور آج بھی وہاں ان کی آبادیاں موجود ہیں جن کا علم خودامریکہ کو بھی بہت بعد میں ہوا۔(١٠٩)

ڈاکٹرحمیداللہ کا استدراک:

دوسرا ضمیمہ ڈاکٹرحمیداللہ صاحب کا وہ استدراک ہے جو انہوں نے پہلے ایڈیشن پرلکھا تھا جسے سید صاحب نے پہلے معارف میں شائع کیا(١١٠) اس میں انہوں نے بعض

مفید مشورے دیئے ہیں کچھ کتابوں کی نشاندہی اور بعض غلط فہمیوں کی طرف سید صاحب کی توجہ مبذول کرائی ہے مثلاً سید صاحب نے داری کے معنی ملاح کے لکھے تھے (۱۱۱) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ کیا اس سے حضرت تمیم الداری کو قبیلہ بنی الدار کی نسبت کے بجائے بحری سفروں کی وجہ سے ملقب سمجھا جائے اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے مزید تحقیق کا مشورہ دیا ہے اور علامہ مقریزی کے ایک رسالہ کی نشاندہی کی ہے جو اسی موضوع پر ہے۔

سید صاحب نے عربوں کی بحری دلچسپی کے شواہد لغات عرب سے پیش کئے ہیں ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں ان لغات کی بھی ورق گردانی ہونی چاہئے تھی جن میں فن وار الفاظ جمع کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے بعض لغات اور رسائل کی نشاندہی کی ہے۔

سید صاحب نے عربوں کی بحری سرگرمیوں پر لغات عرب، اشعار جاہلیت اور قرآن مجید سے استدلال کیا تھا مگر ذخیرہ احادیث سے مطلق تعرض نہیں کیا تھا ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں احادیث کے وسیع ادب کو ہاتھ لگائے بغیر چھوڑ دینا کم از کم طالب علمانہ احتیاط کے خلاف ہے اس سے متعدد شواہد وثبوت پیش کئے جاسکتے تھے جس سے عربوں کے بحری شغف وانہماک اور ان کی مہارت کی مزید وضاحت ہو جاتی۔

عربوں کی جہاز رانی میں لغات عرب سے صرف دس الفاظ نقل کرکے شواہد پیش کئے گئے تھے ڈاکٹر صاحب نے اسے سرسری قرار دیتے ہوئے بعض دوسری تصانیف سے جو سید صاحب کے مطالعہ میں نہ آسکی تھیں بعض اور الفاظ نقل کرکے ان کے معنی اور اس سے عربوں کی بحری دلچسپی پر روشنی ڈالی ہے اور کتابیات کی کمی پر اظہار افسوس کیا ہے۔

تحقیق کا کارواں پیہم سرگرم سفر ہے اس لیے آج ضرورت ہے کہ اس موضوع پر مزید تحقیقات کی جائیں اور جدید ماخذ سے مسلمانوں کی تاریخ کے اس تمدنی پہلو کو اور بھی واضح کیا جائے۔

ہندؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں :

یہ کتاب سید صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے معارف ۱۹۱۸ء میں مسلسل ایک سال تک لکھے تھے۔ یہ مقالہ ابتداء آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں پڑھا گیا تھا۔ سید صاحب کو آخر میں اس کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا موضوع کی مناسبت سے انہوں نے یہ مقالہ ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالہ کردیا جس نے اگست ۱۹۵۴ء میں کتابی صورت میں شائع کیا اس کے ابتک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو اسلامک کلچر حیدرآباد میں دو قسطوں (اکتوبر ۱۹۳۸-اکتوبر ۱۹۳۹ء) میں شائع ہوا۔

اس رسالہ کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں ہندؤں نے کس طرح علمی و تعلیمی ترقی کی اور اس ترقی میں مسلمانوں کا کس قدر حصہ ہے؟ ان سوالوں کا جواب اس میں نہایت محققانہ انداز سے دیا گیا ہے کہ جس دن سے ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق قائم ہوا اور وہ جب تک ہندوستان میں حکمراں رہے انہوں نے ہندؤں کی تعلیم میں فیاضانہ حصہ لیا اور ان کے عہد حکومت میں چھوٹی برادریوں کو ایسا ہی حصول تعلیم کا موقع حاصل ہوا جیسا کہ اعلیٰ ذات کے ہندؤں کو حاصل تھا، مسلمانوں کے عہد میں تعلیم و تربیت کے جو مقامات و مراکز تھے ان میں مسلمانوں کے ساتھ ہندؤں کی تعلیم کا بھی نظم ہوتا تھا حتیٰ کہ امراء کے دربار میں بھی یہ نظم ہوا کرتا تھا مسلم حکمرانوں کے زوال کے بعد مسلم ریاستوں میں بھی یہ سلسلہ تعلیم جاری اور قائم رہا اس سلسلہ میں سید صاحب نے راجہ چندلال اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ اسی تعلیم کا نمونہ تھے۔ پوری بحث پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے شروع میں ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق اور ان کی آمد کا ذکر ان عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کے حوالہ سے کیا گیا ہے جنہوں نے اپنی کتابوں اور سفرناموں میں ہندوستان کے کوائف و احوال کا ذکر

کیا ہے اس کے بعد مسلمانوں کی علمی و عملی فیاضیوں کے ذکر میں ہندو مورخوں، ادیبوں، شاعروں، لغت نویسوں، مترجموں، علوم عقلیہ کے ماہروں، مالی منتظموں، موسیقاروں اور مصوروں کا بیان ہے اس کے علاوہ نجوم، طب، اخلاق وتصوف میں بھی نمایاں ہندوؤں کا ذکر ہے۔ نیز تاریخ و ادب، شعر ولغت، طب، اخلاق، موسیقی مصوری اور ترجمہ نگاری کے فنون کی نمایاں کتابوں کا ذکر مختصر تعارف کے ساتھ پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام غیر مسلم اہل کمال مسلمانوں کے عہد حکومت کی دین تھے اور ان کی اس علمی کامیابی میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ہی کارفرما تھا۔

یہ مختصر لیکن نہایت بیش قیمت تحریر اپنے موضوع پر حرف اول کی حیثیت رکھتی ہے اور حرف آخر بھی قرار دی جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مستند ومعتبر حوالوں اور مآخذوں کی موجودگی سے تحقیق کا بہترین نمونہ خیال کی جاتی ہے۔

دیگر تصنیفات:

ان تاریخی کتابوں کے علاوہ سید صاحب نے دیگر موضوعات پر کتابیں لکھیں ان میں بھی بعض کتابیں تاریخ ہی کا حصہ ہیں مثلاً سیرۃ النبی کی جلدیں اور خطبات مدراس وغیرہ، سیرت خاص مسلمانوں کا ایجاد کردہ ایک فن ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی تاریخ ہی کا حصہ ہے اگر اسے تسلیم کرلیا جائے تو یہ کتابیں بھی سید صاحب کی مجموعی خدمات تاریخ کے دائرہ میں آجاتی ہیں۔

حیات شبلی، حیات امام مالک، سیرت عائشہ اور خیام وغیرہ سوانح عمریاں ہیں، مشرقی ادب میں گو سوانح عمریاں تاریخ ہی کا حصہ تصور کی جاتی ہیں (۱۱۲) اس طرح سید صاحب کی خدمات تاریخ کا دائرہ اور بھی وسیع ہوجاتا ہے تاہم سیرت وسوانح کو علحدہ موضوع تسلیم کرتے ہوئے یہاں سید صاحب کی ان کتابوں سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ سید صاحب کی کچھ کتابیں مثلاً برید فرنگ، سفرنامہ افغانستان اور

یادرفتگان وغیرہ میں بھی تاریخ کے عناصر پائے جاتے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی لکھتے تھے اس میں تاریخ کے عناصر ضرور موجود ہوتے تھے۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم لکھتے ہیں:

> ان کو فکر ونظر کا جو عطیہ قدرت الٰہی کی طرف سے ملا تھا اس کی بدولت تاریخ کے علاوہ جو چیز بھی لکھتے اس میں مورخانہ تجسس کے ساتھ مورخانہ تجزیہ کا رنگ خود بہ خود پیدا ہو جاتا تھا۔ (۱۱۳)

طوالت کے خوف سے ان عناصر تاریخ کی نشاندہی بھی قلم انداز کی جاتی ہے۔

مقالات:

کتابوں کے علاوہ سید صاحب نے علم وادب، تحقیق وتنقید اور تاریخ وغیرہ کے موضوع پر بڑے محققانہ مقالات لکھے جو ماہنامہ معارف اور بعض دوسرے رسائل میں محفوظ ہیں (۱۱۴) ان مقالات میں بڑا تنوع اور گوناگونی ہے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

> اگر تنہا انہی کے تصانیف اور مضامین پڑھ لیے جائیں تو مذہب اسلام، اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تاریخ وتہذیب کے تمام اہم پہلو سامنے آجائیں۔ اس اعتبار سے یہ مضامین مسلمانوں کی علمی تاریخ کا بیش بہا خزانہ ہیں (۱۱۵)

سید صاحب کے مقالات کا انتخاب تین جلدوں میں مقالات سلیمان کے نام سے دارالمصنفین نے شائع کیا ہے یہاں چند اہم تاریخی مقالات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان:

اس میں اصطرلاب اور اس کے ہندوستانی صناعوں کی تفصیلات ہیں یہ دراصل جرمنی کے ایک فاضل ڈاکٹر فان کلیوبر کے استفسار کے جواب میں انہوں نے لکھا تھا، برلن

کے عجائب خانہ میں ہندوستان کے ایک اصطرلابی ضیاء الدین محمد کا بنایا ہوا ایک کرہ تھا جس پر اس کا نام، تاریخ اور مقام لکھا تھا مگر اس کے علاوہ اس کا کچھ حال معلوم نہ تھا چنانچہ سید صاحب نے فان کلیو بر کے جواب میں ضیاء الدین محمد کے وطن عہد اور فن وشہرت کے متعلق معلومات انتہائی تلاش وتفحص سے جمع کر کے یہ مقالہ لکھا اس مقالہ کی دوسری قسط میں اس کے خاندان کے حالات اور اس کے کارناموں کی تفصیلات ہیں (۱۱۶) اپنے موضوع پر اردو میں یہ پہلی تحریر تھی اس لیے بے حد پسند کی گئی۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے انگریزی میں اسے منتقل کیا جو اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا۔

نالندہ کی سیر:

اس میں نالندہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بدھوں کے زمانے کے تمام بقیہ آثار ان کی خانقاہیں، مندر، رصد خانے اور عجائب خانوں سے متعلق مفید معلومات جمع کئے گئے ہیں، اور اس الزام کی تردید بھی کی ہے کہ نالندہ کی خانقاہ مسلمانوں کے زمانے میں ان کے ہاتھوں سے تباہ ہوئی۔ (۱۱۷)

قنوج:

اس مقالہ میں سید صاحب نے یہ دکھایا ہے کہ عرب سیاح وجغرافیہ نویس اور مورخین سندھ میں جس قنوج کا ذکر کرتے ہیں وہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ وہ یہی قنوج ہے جو موجودہ ضلع فرخ آباد میں واقع ہے۔(۱۱۸)

سلطان ٹیپو کی چند باتیں:

۱۹۱۲ء میں سید صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے بنگلور کا سفر کیا تو میسور، سرنگاپٹم اور گڈھ آمبور کی بھی سیر کی۔ انہیں کے الفاظ میں ’’ان تمام

مقامات کو جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلابات رونما ہوئے عبرت کی آنکھوں سے دیکھا۔''
اس مقالہ میں اسی سفر کے مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق کو پیش کیا گیا ہے، میسور، سرنگاپٹم اور گڈھ آمبور کے سیاسی انقلابات کو ایسے مؤثر انداز سے قلمبند کیا ہے کہ اس پورے خطہ کی تاریخ کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے، ٹیپوشہید پر انگریز مورخوں کی غلط بیانیوں کی اس میں تردید بھی تاریخی حقائق سے کی گئی ہے۔ (۱۱۹)

ہندی الاصل اور ہندی النسل مسلمان سلاطین:

اس مقالہ میں سید صاحب نے دہلی، سندھ، ملتان، کشمیر، گجرات اور دکن کے ان سلاطین اور فرماں رواؤں کا ذکر کیا ہے جو اپنی اصل ونسل کے لحاظ سے ہندی تھے اور دکھایا ہے کہ ان سلاطین نے دوسرے سلاطین کے مقابلہ میں ہندوستان کی کم خدمت نہیں کی۔ (۱۲۰)

خلافت اور ہندوستان:

خلافت سید صاحب کا خاص موضوع تھا اس پر انھوں نے متعدد مضامین لکھے یہ مقالہ بھی اس کی ایک کڑی ہے اس میں خلفائے اسلام اور سلاطین ہند کے تعلقات پر اس مقصد سے قلم اٹھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بتایا جائے کہ ہندوستان میں خلافت کی اہمیت کیا تھی اور خود یہاں کے مسلمان فرمانرواؤں اور سلاطین کو خلافت اسلامیہ سے کس قدر مذہبی سیاسی اور جذباتی تعلق تھا۔ (۱۲۱)

سید صاحب کے تاریخی مقالات کی فہرست بہت طویل ہے طوالت کے پیش نظر یہاں چند اہم مقالات کے عناوین لکھے جاتے ہیں۔

اہل اندلس کے اخلاق او رعہدے (علی گڈھ منتھلی نومبر ۱۹۰۵ء) عرب کے یوروپین سیاح (الندوہ ستمبر ۱۹۰۷ء) ابن خلکان اور تاریخ ابن خلکان (الندوہ اکتوبر نومبر

۱۹۰۸ء)اسلامی رصد خانے (الندوہ مارچ و جون ۱۹۰۹ء) روسی مسلمانوں کے کچھ متفرق حالات (الندوہ، مئی ۱۹۱۲ء) انگریزی نصاب تعلیم اور تاریخ اسلام (وکیل (سہ روزہ) امرت سر) عرب ایک مستشرق کی نگاہ میں (معارف فروری ۱۹۱۹ء) خلفائے اسلام اور سلاطین ہند کے بیعت نامے (ستمبر ۱۹۲۱ء) خلفائے آل عثمان اور ہندوستان (اکتوبر ۱۹۲۱ء) بدنصیب کشمیر اور عدل شاہجہانی (اکتوبر ۱۹۲۴ء) مسلمانان ہند کا نظام شرعی (دسمبر ۱۹۲۹ء) مرہٹوں کا فوجی نظام (جولائی ۱۹۳۰ء) سلطان التتمش کا صحیح نام (دسمبر ۱۹۳۲ء) رومن کیتھولک تاریخ کی چندمن گھڑت کہانیاں (اگست ۱۹۴۵ء) عدل جہانگیری کا واقعہ (اپریل ۱۹۴۶ء) برمک اور پرمکھ (اپریل ۱۹۴۸ء) سلطنت اودھ میں ہندوؤں کا حصہ (ماہنامہ صبح امید لکھنؤ اپریل ۱۹۱۹ء) اسلامی حکومت کے عاملین (ماہنامہ مستقل کراچی جنوری ۱۹۵۲ء) وغیرہ۔

ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت:

سید صاحب کی مورخانہ کاوشوں اور ان کی بلند پایہ مورخانہ حیثیت کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں اہل علم نے کیا اس کا بڑا اعتراف وہ استفسارات ہیں جو اہل علم نے ان سے کئے، اور اسی بنیاد پر دسمبر ۱۹۴۴ء میں ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس کے شعبہ تاریخ ہند از منہ وسطی کی صدارت پیش کی گئی اس میں سید صاحب نے جو خطبہ صدارت پیش کیا وہ مورخین ہند کے لیے منشور اور دستور کی حیثیت رکھتا ہے اس میں انہوں نے ازمنہ وسطی کی تاریخ کے متعدد بنیادی مآخذوں کی نشاندہی اور اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے اور فن تاریخ کے بارے میں اس رائے کے ساتھ کانگریس میں شریک مورخین کو نصیحت کی کہ:

> تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے اس لیے
> وہ لوگ جنکی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے اور جن کے ہاتھوں اس کے مستقبل کا

بنانا یا بگاڑنا ہے۔ ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے اور اس حالت میں جب کہ
ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو عداوت اور
نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح پلتا
بڑھتا اور پھلتا اور پھولتا رہے اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے۔(۱۲۲)

آخر میں سید صاحب نے مورخین ہند کے تاریخی کاموں کا مقصد واضح کرتے ہوئے ان کو یہ مفید اور قیمتی مشورہ دیا کہ ''ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لیے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آئند نہ ہو سکے۔(۱۲۳)

آل انڈیا ہسٹاریکل سوسائٹی کی طرح ۱۹۵۱ء میں آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی قائم ہوئی تو سید صاحب کو اس کا رکن منتخب کیا گیا اور اس کے پہلے اجلاس کے شعبہ تاریخ اسلام کی کرسی صدارت تفویض کی گئی جس میں سید صاحب نے خطبہ صدارت کے علاوہ دیبل کی تاریخ پر ایک شاندار مقالہ پڑھا (۱۲۴) یہ ان کی زندگی کی آخری تحریر تھی جس کا تعلق بھی تاریخ ہی سے رہا۔

سید صاحب کی تاریخی خدمات کے اس مفصل مجموعی جائزے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس درجہ بلند اور صاحب نظر مورخ تھے۔

حواشی:

۱۔ اقبال نامہ ص ۷۱-۸۰-۱۹۶ مرتبہ شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ، لاہور و مشاہیر کے خطوط مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء ص ۹۸

۲۔ ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ علامہ شبلی کا نظریہ تاریخ، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ نومبر ۱۹۹۸ء

۳۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۳۸۷ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۷ء
۴۔ مقالات سلیمان حصہ اول ص ۳۹۸ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء
۵۔ ایضاً دیباچہ ص ۱
۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تصحیح اغلاط تاریخی سہ روزہ وکیل امرت سرج ۱۸ (۱۱رمئی ۱۹۱۲)
۷۔ مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص ۵۲۳-۵۲۷ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، طبع چہارم ۱۹۸۳ء
۸۔ ایضاً و شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان ص ۳۴-۳۵ مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء
۹۔ مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۷۵ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء
۱۰۔ حیات سلیمان ص ۳۴-۳۵
۱۱۔ شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۲۶۷ مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ طبع اول ۱۹۹۰ء
۱۲۔ حیات سلیمان ص ۵۰۴
۱۳۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۳۹۱
۱۴۔ ماہنامہ معارف۔ اسلامی ہند کی تاریخ نومبر ۱۹۳۴ء ص ۳۶۷-۳۶۸
۱۵۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۳۹۱
۱۶۔ ملاحظہ ہو الجزیہ مشمولہ مقالات شبلی ج ۱ ص ۱۸۵-۲۲۰ مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء
۱۷۔ ماہنامہ الندوہ، لکھنو دسمبر ۱۹۱۱ء

۱۸۔ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ جنوری، مئی، اگست ۱۹۲۴ء

۱۹۔ مقالات سلیمان ج ۱ ص ۱۸۵ - ۲۴۳

۲۰۔ شذرات سلیمانی ج ۲ ص ۳۰۷

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ تفصیل ملاحظہ ہو ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، فروری تا اپریل ۱۹۳۶ء

۲۴۔ حیات سلیمان ص ۳۹۹ - ۴۰۰

۲۵۔ مقالات سلیمان جلد اول ص ۶ دیباچہ

۲۶۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۳۱۰

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ ایضاً ص ۳۴۱

۲۹۔ ایضاً ص ۳۴۱ - ۳۴۲

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً ص ۳۴۲

۳۳۔ ایضاً ص ۳۴۴

۳۴۔ ایضاً ص ۳۸۷

۳۵۔ ایضاً ص ۳۰۰

۳۶۔ شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۱۵۱ - ۱۵۲

۳۷۔ ایضاً ص ۱۵۳ - ۱۵۴

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ایضاً ص ۱۵۲

۴۰۔ ایضاً ص ۲۹۹-۳۰۰

۴۱۔ ایضاً

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۹۲

۴۴۔ ایضاً

۴۵۔ شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۳۲۴

۴۶۔ ایضاً ص ۳۲۳-۳۲۴

۴۷۔ ایضاً ص ۳۲۵

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ ایضاً ص ۳۲۲-۳۲۳

۵۰۔ ایضاً ص ۳۲۶

۵۱۔ ایضاً ص ۳۲۷-۳۲۸

۵۲۔ ایضاً ص ۳۲۴-۳۲۵

۵۳۔ ایضاً ص ۲۶۷

۵۳۔ ایضاً

۵۴۔ دیکھیے اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر از علامہ شبلی نعمانی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء

۵۵۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۱۳۳-۱۳۴

۵۶۔ دیکھیے الجزیہ مقالات شبلی ج ا ص ۱۸۵-۲۲۰

۵۷۔ شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۳۰۲

۵۸۔ ایضاً

۵۹۔ ایضاً ص ۳۲۶

۶۰۔ مقالات سلیمان جلد اول حصہ ۳۷۷

۶۱۔ معارف جون ۱۹۲۹ء

۶۲۔ مقالات سلیمان جلد اول ص ۲۵۳

۶۳۔ شذرات سلیمانی حصہ سوم ص ۱۰۷-۱۰۸، مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۹۸ء

۶۴۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۱۳۷

۶۵۔ شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۲۶۷-۲۶۸

۶۶۔ ایضاً

۶۷۔ ایضاً

۶۸۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۲۰۳-۲۰۴

۶۹۔ ایضاً

۷۰۔ ایضاً ص ۲۰۴-۲۰۵

۷۱۔ حیات سلیمان ص ۳۱۵-۳۲۰

۷۲۔ شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۲۶۸-۲۶۹

۷۳۔ ایضاً حصہ دوم ص ۲۰۵

۷۴۔ ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۱۶ء وتعارف دارالمصنفین

۷۵۔ ایضاً۔ وشذرات سلیمانی حصہ اول ص ۴ وجلد سوم ص ۲۰۹

۷۶۔ اشاریہ معارف۔ خدا بخش اورنیٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۷۷۔ شذرات سلیمانی حصہ اول ص ۲۸-۲۹

۷۸۔ ایضاً

۷۹۔ ایضاً حصہ دوم ص ۳۹۰

۸۰۔ بزم تاریخ ہند، ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۳۲ء ص ۳۲۵-۳۲۸

۸۱۔ ایضاً ص ۳۳۰
۸۲۔ شذرات سلیمانی حصہ سوم ص ۷۰-۷۱
۸۳۔ ایضاً
۸۴۔ ایضاً ص ۱۵۱-۱۵۲
۸۵۔ ایضاً ص ۲
۸۶۔ ایضاً ص ۶۷-۷۷
۸۷۔ ماہنامہ معارف نومبر ۱۹۳۲ء ص ۳۳۰-۳۳۱ و شذرات سلیمانی دوم ص ۴۰۳
۸۸۔ معارف دسمبر ۱۹۳۲ء و حیات سلیمان ص ۴۲۷
۸۹۔ سیکڑوں برس۔ معارف
۹۰۔ ماہنامہ معارف دسمبر ۱۹۳۲ء ص ۴۰۵-۵۰۷
۹۰۔ ایضاً ص ۴۰۷-۴۱۱
۹۱۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۴۰۴-۴۰۵
۹۲۔ حیات سلیمان ص ۴۲۷
۹۳۔ مولانا سید سلیمان ندوی، ارض القرآن اول ص ۲، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ
۹۴۔ ایضاً ص ۴
۹۵۔ مولانا سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات ص ۱ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ
۹۶۔ ایضاً ص ۱۰-۱۱
۹۷۔ ایضاً
۹۸۔ ایضاً ص ۹۲
۹۹۔ ایضاً ص ۱۱۴
۱۰۰۔ ایضاً ص ۱۷۷
۱۰۱۔ ایضاً ص ۱۸۷

۱۰۲۔ مسعود الرحمٰن خاں ندوی، مطالعہ سلیمانی ص ۵۹، ممتاز تاریخ نگار از پروفیسر عبدالباری، بزم سلیمان بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۰۳۔ مولانا سید سلیمان ندوی، عربوں کی جہاز رانی ص ۲۰۳، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱۹۳۵ء

۱۰۴۔ ایضاً ص ۱

۱۰۵۔ ایضاً ص ۳

۱۰۶۔ ایضاً ص ۱۸-۱۹

۱۰۷۔ ایضاً

۱۰۸۔ ایضاً ص ۴۹

۱۰۹۔ ایضاً ص ۱۶۴-۲۰۲

۱۱۰۔ معارف ج ۳۷ شمارہ ۵-۶

۱۱۱۔ عربوں کی جہاز رانی ص ۸

۱۱۲۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، معارف سلیمان نمبر

۱۱۳۔ مقالات سلیمان جلد اول ص ۳

۱۱۴۔ دیکھیے یادگار سلیمان مرتبہ عبدالقوی دسنوی، بھوپال۔

۱۱۵۔ دیباچہ مقالات سلیمان جلد دوم ص ۲

۱۱۶۔ ماہنامہ معارف اگست ۱۹۳۳ء دسمبر ۱۹۳۷ء

۱۱۷۔ معارف فروری ۱۹۳۵ء و مقالات سلیمان ج ۱ ص ۲۷۸-۲۹۲

۱۱۸۔ ماہنامہ معارف مارچ ۱۹۴۴ء و مقالات سلیمان ج ۱ ص ۳۵۳-۳۷۳

۱۱۹۔ ماہنامہ معارف فروری ۱۹۱۸ء و مقالات سلیمان ج ۱ ص ۹۹-۱۱۱

۱۲۰۔ معارف اپریل ۱۹۵۱ء

۱۲۱۔ ایضاً دسمبر ۱۹۲۰ء و اکتوبر ۱۹۲۱ء

۱۲۲۔ مقالات سلیمان ج ا ص ۲۸۳

۱۲۳۔ ایضاً ص ۴۰۳

۱۲۴۔ حیات سلیمان ص ۵۸۰

کتابیات

۱۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر از علامہ شبلی نعمانی مطبوعہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء

۲۔ اشاریہ معارف از ڈاکٹر عابد رضا بیدار، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۳۔ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ لاہور

۴۔ ارض القرآن اول، دوم از مولانا سید سلیمان ندوی مطبوعہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۵۔ تعارف دارالمصنفین شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

۶۔ حیات سلیمان از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء

۷۔ حیات شبلی از مولانا سید سلیمان ندوی مطبوعہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

۸۔ شذرات سلیمانی اول، دوم، سوم۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۸ء

۹۔ عربوں کی جہاز رانی از مولانا سید سلیمان ندوی۔ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱۹۳۵ء

۱۰۔ عرب و ہند کے تعلقات از مولانا سید سلیمان ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

۱۱۔ مشاہیر کے خطوط شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء

۱۲۔ مقالات سلیمان اول مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء

۱۳۔ مقالات سلیمان دوم، سوم مرتبہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ

۱۴۔ مکاتیب شبلی اول، دوم۔ مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۹-۱۹۷۱ء

۱۵۔ مقالات شبلی اول مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

۱۶۔ مطالعہ سلیمانی مرتبہ مسعود الرحمان خاں ندوی، بزم سلیمانی بھوپال ۱۹۸۶ء

۱۷۔ معارف سلیمان نمبر مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء

۱۸۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں از مولانا سید سلیمان ندوی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی پاکستان

۱۹۔ یادگار سلیمان مرتبہ عبدالقوی دسنوی، بھوپال

رسائل

الندوہ لکھنو دسمبر ۱۹۱۱ء

معارف اعظم گڑھ جولائی ۱۹۱۶ء، دسمبر ۱۹۲۰ء، اکتوبر ۱۹۲۱ء، جنوری-مئی-اگست ۱۹۲۴ء، جون ۱۹۲۹ء، نومبر-دسمبر ۱۹۳۲ء، اگست ۱۹۳۳ء، نومبر ۱۹۳۴ء، فروری ۱۹۳۵ء، فروری-مارچ-اپریل ۱۹۳۶ء، دسمبر ۱۹۳۷ء، مارچ ۱۹۴۴ء، اپریل ۱۹۵۱ء، نومبر ۱۹۹۸ء، نومبر ۱۹۹۹ء وغیرہ۔

*****

Allama Syed Sulaiman Nadvi Ba Haisiyat-i Moarrikh

Dr. M. Ilyas Azami

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna